سہ ماہی

فروغِ مرثیہ

کینیڈا

(تیرھواں شمارہ)

چوتھا سال

اگست ۲۰۲۳ء بمطابق محرم الحرام ۱۴۴۵ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

اِس شمارے میں شامل مضامین، تنقیدی رائے یا شعری وفکری خیال سے اِدارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادارے کی پچیسویں پیش کش

سہ ماہی

کینیڈا

فروغِ مرثیہ

اگست ۲۰۲۳ء بمطابق محرم الحرام ۱۴۴۵ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

جملہ حقوق بحقِ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل محفوظ ہیں

عنوان	:	فروغِ مرثیہ (تیرھواں شمارہ)
اشاعت	:	اگست ۲۰۲۳ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
ایڈیٹر	:	اصغر مہدی اشعر
ناشر	:	فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل، کینیڈا
طابع	:	RB پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی
قیمت فی شمارہ	:	۱۵/ڈالر، ۱۰/پونڈ، ۲۵۰ روپیہ
ای میل	:	faroghemarsiya@gmail.com
فون	:	+1-905-462-9211
پتہ	:	441 JELINIK TERRACE, MILTON ONTARIO, CANADA L9T7N2

فروغِ مرثیہ

سہ ماہی
کینیڈا

ترتیب

۱۔اداریہ ---- اصغر مہدی اشعر (کینیڈا) ---- ۴
۲۔سلام ---- امجد اسلام امجد (پاکستان) ---- ۵
۳۔ڈاکٹر ہلال نقوی کے مرثیوں میں جمالیاتی تجرید ---- عادل مختار (پاکستان) ---- ۶
۴۔غیر مطبوعہ مرثیہ ---- سیّد جاوید حسن (پاکستان) ---- ۱۱
۵۔میر انیس کی سلام گوئی اور اس کا مزاج ---- وفا نقوی (انڈیا) ---- ۲۲
۶۔سلام ---- اختر آصف زیدی (کینیڈا) ---- ۲۸
۷۔غیر مطبوعہ مرثیہ بعنوان خاصانِ خدا ---- ڈاکٹر ناشر نقوی (انڈیا) ---- ۲۹
۸۔سلام ---- احمر شہوار (امریکہ) ---- ۴۰
۹۔علامہ طالب جوہری ورثائی تنقید ---- فرحان رضا (پاکستان) ---- ۴۱
۱۰۔سلام ---- ساجد علی (کینیڈا) ---- ۴۳
۱۱۔غیر مطبوعہ مرثیہ حق ---- علی عرفان (کینیڈا) ---- ۴۴
۱۲۔سلام ---- پروین حیدر (پاکستان) ---- ۴۸
۱۳۔مرثیے کی تنقید اور بنگال ---- ڈاکٹر عابد حسین حیدری (انڈیا) ---- ۴۹
۱۴۔غدیر ---- عارف کاظمی (امریکہ) ---- ۷۱
۱۵۔چھنّو لال دلگیر ---- اصغر مہدی اشعر (کینیڈا) ---- ۷۲
۱۶۔اُردو مرثیہ اور انسانی اقدار ---- ڈاکٹر (پروفیسر) سید علی عرفان نقوی (انڈیا) ---- ۸۲

اداریہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فروغِ مرثیہ کا ۱۳ رواں شمارہ آپ کے پیش نظر ہے، یہ شمارہ اب اشاعت کے چوتھے سال میں ہے اور بغیر کسی تاخیر کے پیش کیا جارہا ہے، الٰہ آباد اور کراچی سے شائع ہونے والا یہ شمارہ ڈاکٹر ہلال نقوی کے رثائی ادب کے نقش قدم تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی شامل حال ہے۔

محرم ۱۴۴۵ھ کا عشرہ گذر چکا ہے، اس سال حرفِ حق کے عنوان سے ۱۰ مرثیے پیش کیے گئے حقیر کے غریب خانے پر مرثیے کا تیسرا سالانہ عشرہ منعقد ہوا، دبیرؔ کے مرثیے کی چوتھی جلد اب تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی، اس جلد میں ۵۸ مرثیے پیش کیے جارہے ہیں اور فرہنگِ دبیرؔ میں شامل فہرستِ مرثیہ کے حساب سے مرثیہ نمبر ۱۱۹ سے مرثیہ نمبر ۱۷۶ اس جلد میں شامل ہے۔ ڈاکٹر ہلالؔ نقوی، جناب جاؔوید حسن، جناب ریحان احمد، جناب جوہرؔ عباس اور جناب بشارت حسین کا شکریہ جن کی مدد سے یہ عنقریب اشاعت کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی اور دبیرؔ کے ۴۵۶ مطبوعہ مرثیوں کو آپ تک پہنچانے کا وعدہ پورا ہونے کے قریب ہے۔

فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل کی پیش کردہ کتابوں میں امسال ایک اور کتاب کا اضافہ بھی شامل ہے، یہ کتاب جلال پور کے جناب زائر حسین ثالثی کی مرتب کردہ ہے جس کا عنوان ''اجزائے مرثیہ کا موجد میر ضمیرؔ'' ہے۔ یہ کتاب میر ضمیرؔ کے ۱۷ مرثیوں پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں ضمیرؔ کے ۴ سلام اور ۱۲ رباعیات شامل کی گئی ہیں۔

فرہنگِ مونسؔ کی تکمیل کا کام جاری ہے اور ان شاء اللہ یہ کتاب ۲۰۲۴ء میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ آج یہ اداریہ مانچسٹر کے wythenshawe hospital سے تحریر کررہا ہوں، جہاں میری ہمشیرہ نزہت زہرا کینسر سے جنگ ہار چکی ہیں اور میں خدا سے صبر اور ہمت کی دعا مانگ رہا ہوں کہ ماں باپ کے فراق کے بعد اس غم کو جھیلنا ناممکن سا لگتا ہے۔

طالبِ دعا

اصغر مہدی اشعر

مانچسٹر، برطانیہ

۶ رجولائی، ۲۰۲۳ء

التماسِ سورۂ فاتحہ نزہت زہرا بنتِ سیّد محمد جعفر رضوی، تاریخِ وفات ۱۰ رجولائی ۲۰۲۳ء

سلام

امجد اسلام امجدؔ

جلتے تھے ہونٹ پیاس سے ، دریا تھا سامنے
لیکن وقارِ تشنگی ، ٹھہرا تھا سامنے

تنہا ہو جیسے کوئی دِیا آندھیوں کے بیچ
ایسے وہ اُس ہجوم کے آیا تھا سامنے

خیموں میں آگ، ریت پہ لاشے پڑے ہوئے
ڈھلتی تھی دھوپ ، شام تھی ، صحرا تھا سامنے

لاکھوں کی تھی حسینؑ پہ نظریں لگی ہوئیں
لیکن وہاں تو ایک ہی رستہ تھا سامنے

یہ بھی نہیں کہ اُس کو سزا کی خبر نہ تھی
ہونا تھا جو بھی فیصلہ لکھّا تھا سامنے

اک پَل میں روشنی کے معانی بدل گئے
اُس نے عجب چراغ سا رکھا تھا سامنے

لکھتا تھا ریت پر وہ لہو سے پیامِ حق
دل کی ہر ایک بات وہ کہتا تھا سامنے

دستِ یزید میں نہ دیا ہاتھ ایک بار
ورنہ ہر ایک غم کا مداوا تھا سامنے

پیچھے تھی چیختی ہوئی زینبؑ ، برہنہ سر
عباسؑ کا کٹا ہوا لاشہ تھا سامنے

تھا صبر بے مثال تو جرأت تھی بے نظیر
اُس آخری نگاہ نے بھی دیکھا تھا سامنے

حاضر تھے واں سلام کو تارے بھی اشک بھی
مقتل حسینؑ ابنِ علیؑ کا تھا سامنے

ڈاکٹر ہلال نقوی کے مرثیوں میں جمالیاتی تجرید

عادل مختار

ڈاکٹر ہلال نقوی عصرِ جدید کے رثائی ادب کے ممتاز محقق اور تخلیق کار ہیں۔ اگر بیسویں صدی میں جمیل مظہری، نسیم امروہوی اور جوش ملیح آبادی جدید مرثیہ کی تابناک آوازیں تھیں تو اُسی صدی کے ہی آخری ربع میں منبرِ مرثیہ پر ہلال صاحب کا ظہور ایک انتہائی اہم اور قابل ذکر واقعہ رہا اور اب یہ واقعہ اپنی اہمیت کے ساتھ اکیسویں صدی کے پہلے ربع کے تکامل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تمام عرصے میں مذکورہ آوازوں کے بعد ہلال صاحب جدید مرثیہ کی مضبوط ترین آواز کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

ہلال صاحب کے فن کے حوالے سے جس پہلو کا شدّت سے اور بار بار تذکرہ ملتا ہے وہ ان کا مسدّس کے تیسرے مصرع کو غیر مقید کرنا ہے۔ اس عمل کو شروع شروع میں بعض حضرات نے ایک انحرافی عمل قرار دیا جب کہ وقت کے ساتھ ساتھ جب ان کے مرثیوں کو پڑھا گیا اور دقت کی گئی تو یہی عمل انحرافی کی بجائے انجذابی عمل کے طور پر سامنے آیا مگر ہلال صاحب کا اجتہاد فقط ہیئتی حوالے سے ہی قابل ذکر نہیں بلکہ ان کے مرثیوں میں ان کے تخلیقی شعور کا مختلف ابعاد میں اظہار کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

ہلال صاحب کے مرثیوں کے مطالعے کے بعد ان کی فکر اور فن پر بہت سی بحثوں کے باب کھل سکتے ہیں۔ مثلاً ان کا رثائی تعقّل اور رثائی فکر کے زاویے، ان کی انقلابی سوچ یا ان کے مرثیوں میں موجود ڈرامائیت کے عناصر وغیرہ۔ مگر مجھے ان کے مرثیوں کے مطالعہ کے دوران اس بات کا شدید احساس ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح عالمی ادب نے تجریدی آرٹ کے اثرات قبول کیے ہیں اسی طرح ہلال صاحب کے مرثیوں میں بھی تجریدی عناصر یا تجریدی ابعاد اپنی بھرپور معنی خیزی کے ساتھ تخلیق کیے گئے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے اپنے مرثیوں میں منصبِ شعر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی بصری حقیقت یا خود تجریدی آرٹ میں ہی فکر کو مقید نہیں رکھا بلکہ شعر کے واسطے کو استعمال کرتے ہوئے تجرّد کی سطح کو اس قدر بلند کرتے ہوئے مفاہیم کا اظہار کیا کہ جس سطح پر کسی دوسرے فن کا عمل میں آنا ممکن نظر نہیں آتا۔

تجریدی آرٹ خود بصری حقیقتوں کو جوں کا توں پیش نہیں کرتا بلکہ شکلوں رنگوں اور ساخت کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اک پیچیدہ سے پیچیدہ مفہوم مؤثر طریقے سے اظہار پا سکے۔ اس آرٹ میں موجود شکلوں کی بنیاد خارج میں موجود بصری حقیقتوں پر نہیں ہوتی اس آرٹ کے شہپاروں میں اکثر کوئی نہ کوئی اخلاقی، نفسیاتی، فکری یا روحانی پہلو دکھائی دیتا ہے کہ جس میں نظم، تطہیر و تہذیب اور روحانیت جیسے فضائل کے لیے موئے قلم قیام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر جب ہلال صاحب کے مرثیوں میں تجریدی عناصر کو دیکھا جاتا ہے تو وہ تجرید میں بھی بالواسطہ شعر مفاہیم کو تجرّد کی اس سطح پر بیان کرتے ہیں کہ خود تجریدی آرٹ اس سطح تک پہنچتا دکھائی نہیں دیتا۔

ہلالؔ صاحب شعری قوت کا ادراک بھی رکھتے ہیں اور اسے بھرپور طریقے سے بروئے کار لانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ان کے تخلیقی شعور میں یہ بات راسخ نظر آتی ہے کہ شاعری فنون میں بھی لطیف ترین فن ہے۔اور اس فن میں فقط موجود اور محسوس نہیں بلکہ نا موجود حقیقتوں کا اظہار اور ابلاغ بھی ممکن ہے اور ہلالؔ صاحب کے مرثیوں میں اس قسم کا اظہار جمالیاتی آب وتاب کے ساتھ سطحِ قرطاس پر نظر آتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ مرثیہ کہ جسے مذہبی شاعری سمجھا گیا اور سمجھایا گیا جب ڈاکٹر صاحب کے مرثیوں کو پڑھتے ہیں تو وہی مرثیہ مذہبی سے زیادہ ایک بھرپور صنفِ شعر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ان کے مرثیے کا عنوان چاہے" ہاتھ" ہو یا" الحمد" ان کے اشعار میں فکر اور جمال کا ایک مخصوص مرکّب ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اس طرح ان کے مرثیے مذہبی شعور سے بڑھ کر جمالیاتی شعور کے آئینہ دار ہیں کہ جس میں جمالیات باطن یا تجرّد کا اظہار ہی نہیں کرتی بلکہ اظہار کی سطح پر مفاہیم کی ترکیب اور ترتیب بھی اسی کے ہاتھوں انجام پاتی ہے اور ان تمام خصوصیات کا حاصل یہ ہے کہ شعری تجرید ڈاکٹر صاحب کے مرثیوں میں مجموعی تجریدی آرٹ کو چیلنج کرتی نظر آتی ہے۔

شعری تجرید کی تصویری تجرید پر فوقیت کی مثال کے لیے ہلالؔ صاحب کے مرثیے'' حُر'' کا بند ۹۹ ملاحظہ ہو:

دیکھے فلک یہ شان یہ پایا دلیر کا ماضی کی راکھ بن گیا سایا دلیر کا
پہلے تو جہلِ فکر کے کم قامتوں میں تھا عظمت بڑھی تو قد نکل آیا دلیر کا
سورج جو بڑھ کے تابش دُر دیکھنے لگا
اوجِ علم بھی قامتِ حُر دیکھنے لگا

اس بند کا دوسرا مصرع'' ماضی کی راکھ بن گیا سایا دلیر کا'' ایک تجریدی عکس ہے۔اس عکس میں سایہ اور راکھ مکان سے تعلق رکھنے والی اشیاء ہیں اور خارج میں اپنی بصری حقیقتیں رکھتی ہیں مگر اس شعری عکس میں'' ماضی'' بطورِ بُعدِ زمانی بھی موجود ہے۔

اب اگر دلیر کے سائے کو راکھ دکھانا مقصود ہو تو ایسے مفہوم کا اظہار تجریدی مصوری میں بھی ممکن ہے مگر'' ماضی'' کے بُعدِ زمانی کے بعد یہ امیج تجریدی مصوری کی سطح سے ترفُّع حاصل کر چکا ہے۔ہلالؔ صاحب نے زمانی اور مکانی ابعاد کو یکجا کر کے اس مرکّب کو جمالیاتی تجرّد دے کر مصوری یا تجریدی آرٹ سے شعر کا ترفُّع اور علو ثابت کیا ہے اور اس ترکیب کے بعد اس عکس کا فقط کلام میں ہی تخلیقی امکان نظر آتا ہے۔

اگر'' ہاتھ''،'' چراغ'' اور'' آواز'' ایسے مرثیوں کی بات کی جائے تو یہ مرثیے مجموعی طور پر اپنے عنوان سے لے کر اپنے اختتام تک جمالیاتی تجرّد کی آب وتاب کے ساتھ تخلیقی عمل سے گزرے ہیں۔

مارشل مکلوہن جس طرح معاشرہ اور ٹیکنالوجی کو انسانی جسم کے پھیلاؤ کی ہی صورت قرار دیتا ہے اور جس طرح ٹھوس سے تجرّد اور تجرّد سے ٹھوس کی طرف رجوع کا قائل ہے اسی طرح ہلالؔ صاحب نے'' ہاتھ''،'' چراغ'' اور'' آواز'' ایسے مظاہر کو رزمیہ وسعت دے کر معاشرہ، ٹیکنالوجی، تہذیب وتمدّن اور تاریخ کو انہیں مظاہر کی وسعت قرار دیا ہے۔'' ہاتھ''،'' چراغ'' اور'' آواز'' ایسے عنوانات کے جو بصری یا خارجی حقیقتیں رکھتے ہیں وہ مرثیے کے سفر میں ابتدا سے انتہا تک ٹھوس سے مجرّد اور مجرّد سے ٹھوس کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اور جدید ادب میں اسی قسم کا رجوع ایک عالمی رجحان ہے۔

مثال کے طور پر مرثیہ ہاتھ کا بند ۱۱ ملاحظہ ہو

جب نخل کی تراش سے نکلا قلم کا قد ظاہر ہوئے نگاہ پہ افکار کے جسد
نقطوں کی تخم کیش و نمو گیر فصل میں کاغذ پہ لہلہانے لگا سبزۂ خرد
آیا قلم جو موج خرامی کے واسطے
بڑھنے لگے حروف سلامی کے واسطے

اس بند کے پہلے مصرع میں نخل کی تراش سے قلم کا نکلنا مصوّری میں کسی نہ کسی طور ممکن ہو جائے گا مگر دوسرے مصرع میں ''افکار کے جسد'' ایسی تجرید مصوّری کے لیے ایک مشکل امر ہے۔ اس بند کے دوسرے مصرع میں نگاہ پر افکار کے جسد کا ظاہر ہونا ایک ایسا تجرّد ہے کہ جس کا کماحقہٗ اظہار اور تخلیق سوائے شاعری کے ممکن ہی نہیں۔ اور اسی افکار کے جسد ایسے مفہوم کے ظہور کو جان کیٹس کی Ode On Indolence میں دیکھا جا سکتا۔ ہے اس کے علاوہ مذکورہ بند کا چوتھا مصرع بھی شاعری سے متعلق جمالیاتی تجرّد کی ایک بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے:

''کاغذ پہ لہلہانے لگا سبزۂ خرد''

مصوری میں کاغذ پر کسی بھی رنگ میں سبزہ دکھایا جا سکتا ہے مگر ''سبزۂ خرد'' کی ترکیب کی تخلیق امتیاز شعر ہی ہے۔

اسی طرح مرثیہ ہاتھ کا بند ۱۵ میں تجرید کا جمال شعر سے ہی وابستہ نظر آتا ہے۔

اک ہاتھ ہے یہ کتنے شمائل لیے ہوئے ابلاغ کے ہزار وسائل لیے ہوئے
رکھے کفِ ورق پہ کتابوں کے آفتاب برگِ قلم پہ کوہِ رسائل لیے ہوئے

اس بند میں کفِ ورق، کتابوں کے آفتاب، برگِ قلم اور کوہِ رسائل ایسی تراکیب میں مختلف الاوضاع اشیاء کو آپس میں جس سہولت سے باندھا گیا ہے اس کی مثالیں انگریزی ادب کے سترہویں صدی کے معروف شاعر جان ڈن کی شاعری میں ملتی ہیں۔

شعر میں اس قسم کے مرکّبات کو اٹھارہویں صدی کے معروف نقّاد نے خلاّق ہونے کی خواہش کے وفور اور بے جوڑ ہونے کے باعث غیر فطری قرار دیا تھا مگر بعد میں بیسویں صدی کے شعرا نے جان ڈن کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی شاعری سے جو اخذ کیا اس کا اہم ترین اظہار ٹی ایس ایلیٹ نے اپنے اس تبصرے میں کیا جو اس نے مابعد الطبیعاتی شعرا کے انتخابی مجموعہ پر کیا تھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۱ء میں پروفیسر گریرسن نے شائع کیا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے مختلف الاوضاع کے اتحاد پر غیر فطری ہونے کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا جب ایک شاعر کا ذہن اپنے کام کے لیے مکمل آمادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تمام متعلقات سے لیس ہو جاتا ہے تو اس کے لیے مختلف النوع تجربات کو ایک ہی سطح پر ملانے میں مصروف رہتا ہے اور اختلاط اور ارتباط کے نتیجے میں بننے والے نئے کُل اس کے ہاں تشکیل پا رہے ہوتے ہیں۔

ہلالؔ صاحب کے ہاں بھی ان مختلف الانواع عناصر سے ترکیب پانے والا تجرّد جدتِ فکر کی مثال ہے اور اس سے پیدا ہونے والے نئے کُل یعنی نئے مفاہیم بھی جدید مزاج سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کا اعتبار بھی جدید اذہان میں قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس سطح کا یا

اس نوع کا مفہوم موئے قلم کے سپرد کیا جائے تو اس میں عناصر کے مابین انتہائی مغایرت کی بنا پر امکانِ قبح رہے گا۔

لہٰذا اس مقام پر شعر کا علو کسی اضافی یا غیر متعلقہ بُعد کی بنا پر بھی نہیں بلکہ ''میڈیم'' کی تنزیہ کے باعث ہے۔

اگر مرثیہ ''آواز'' کی بات کی جائے تو اس مرثیے کے پہلے ہی بند کی بیت بھرپور جمالیاتی تجرّد کی حامل ہے:

چہرہ نہ کیوں حسین ہو حسنِ مقال کا
آواز کی دھنک پہ ہے منبر خیال کا

اگر دیکھا جائے تو دھنک پر منبر کا تصوّر تصویر میں مشکل نہیں مگر ''آواز کی دھنک'' ایسے مفہوم کا اظہار شعر سے ہی تعلق رکھتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر منبرِ خیال خالصتاً شعری تصوّر ہے کہ جو شعر میں ہی جمالیاتی اظہار پا سکتا ہے۔

مرثیہ ''آواز'' کا بند ۱۰ کا تیسرا اور چوتھا مصرع ملاحظہ ہو:

بیساکھیاں قلم کی اٹھائیں گی کس طرح
آواز تھام لے تو ورق سے اٹھیں حروف

قلم کی بیساکھیوں کے مفہوم کو موئے قلم سے اظہار پانے میں کچھ مانع نظر نہیں آتا اور ایک لحاظ سے یہ تجرید مصوّری میں ایک بہترین طریقے سے اظہار پا سکتی ہے مگر آواز کا حروف کو تھامنا اور حروف کا ورق سے اٹھنا یہ مفہوم صرف شعر میں اظہار پانے کا مستحق ہے۔

''آواز تھام لے تو۔۔۔'' اس میں ''تو'' کے سبب ایک امکانی بُعد کا اضافہ ہوا ہے اور یہ بُعد فقط کلام میں ہی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر شاعری تجرّد کی برترین سطح پر مفہوم کی تعمیل کرتی نظر آتی ہے کہ جس سے شعر کا علو اور امتیاز ثابت ہو رہا ہے۔

مرثیہ ''آواز'' کے ہی بند ۲۳ کی بیت میں ہلال صاحب حروف ایسے ٹھوس مظاہر سے الٰہی ارادہ جیسے مجرّد کی طرف ترفّع کی لطیف ترین مثال پیش کرتے ہیں کہ جو عرفان، شعریت، تجرّد، جمال اور جلال کا اک عجیب مرکّب ہے کہ جس کی تخلیق ممکن ہی نہیں کہ کلام کے علاوہ دیگر صورت میں منصۂ شعور پر ظاہر ہو۔ فرماتے ہیں:

دو حرف ارتقاء کی رکابیں لیے ہوئے
صوتِ جلالِ کُن کی طنابیں لیے ہوئے

یہاں کاف اور نون ان دو حروف کا ارتقا کی رکابوں پر دباؤ اور اس دباؤ کے سبب ان رکابوں میں پیدا ہونے والا کساؤ اور ''آوازِ کُن'' کی طنابوں میں موجود تناؤ فقط شعر کے ذریعے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر جس مفہوم کا اظہار یہ دو مصرعے کر رہے ہیں اس مفہوم کا اظہار شعر کا طرۂ امتیاز ہی کہا جا سکتا ہے اور اس مقام پر ہلالؔ صاحب شعر اور شعر کے واسطے سے جدید مرثیہ کے ترفّع اور تخلیقی امکان کی وسعت کو ثابت کرنے میں واضح طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔

ایک گہرے شعور کا مالک فنکار کسی خاص حلقہ میں محدود نہیں رہتا بلکہ وہ عالمی اثرات کو قبول بھی کرتا ہے اور اس بنا پر اپنا ردّعمل بھی اپنی متعلقہ صنف میں تخلیق کرتا ہے اور ہلالؔ صاحب ایسے صاحبِ فن کے مرثیوں کی تخلیقی بنیاد اسی عالمی سطح کے شعور پر استوار دکھائی دیتی ہے اور اسی سبب سے ان کے مرثیے مذہبی حلقہ کی بجائے خالصتاً فکری اور فنی ابعاد کے تحت عالمی ادب کی سطح پر توجہ کے متقاضی ہیں۔

ہلالؔ صاحب کے فن کی جدید عالمی ادب کے تناظر میں اہمیت کے حوالے سے اس مضمون میں صرف ایک رُخ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جبکہ جمالیاتی تجرّد ہی نہیں بلکہ ان کی فکر میں اور فن میں دیگر جدید عناصر کی موجودگی بھی ان کی اہمیت اور عظمت کو ثابت کرتی ہے۔اس مضمون میں چونکہ جمالیاتی تجرّد کو ہی موضوع بحث قرار دیا گیا ہے لہٰذا اگر ہم جدید عالمی ادب کے رجحانات اور ان کی وجوہات کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جدید انسان میں جو موجود ٹھوس حقائق سے ایک خاص حد تک ک منحرف ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے اس جدید مزاج کے ہی خطوط پر آج کا فلسفہ اور فن آگے بڑھ رہے ہیں۔لہٰذا عصرِ جدید کی حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس مادیت سے نڈھال دور میں بھی فنکار کا رجحان مادیّت کی بجائے تجرّد کی طرف ہے۔

عصر حاضر کے فنون تجرّد اور تعقل کی منزلت رکھتے ہیں اور اس عالمی رجحان کے تحت ہلالؔ صاحب کے مرثیوں میں موجود جمالیاتی تجرّد کے عناصر جدید عالمی ادب میں مرثیے کو کسی ایک طبقہ میں محدود نہیں کرتے بلکہ اسے ایک عالمی اور آفاقی حیثیت عطا کرتے ہیں اور اسی جدید مرثیے کے تحت خود ہلالؔ صاحب کی جدید عالمی ادب میں دیگر فنون کے ماہرین کی طرح رثائی ادب کے حوالے شے استحقاقی حیثیت مسلم قرار پاتی ہے۔اور اس جہت کی طرف توجہ بھی ہلالؔ صاحب کی اہمیت کو مزید واضح کرتی ہے کہ جمالیاتی تجرّد اور اس شعر کے پیرائے میں تخلیق کیا گیا تجرّد جس قدر بھی پیچیدہ ہی کیوں نہ ہو مگر ہلال صاحب کے مرثیوں میں یہ جمالیاتی تجرید بھی ایک عمومی اور عوامی شان رکھتی ہے کہ جس سے ان کے قارئین و سامعین مضطرب نہیں ہوتے بلکہ ہر مرحلے پر اک لطیف تجربہ سے روشناس ہوتے ہیں۔اس جدید اور پیچیدہ تر دور میں آرٹ اور خصوصاً شاعری کے ساتھ عوام کا تعلق مضبوط کیئے رکھنا کسی اور صنف میں ضروری ہو یا نہ ہو جدید مرثیہ میں بہر طور اس تعلق کی مضبوطی مہم ہے اور جدید ادب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بھی اسی مرثیہ اور عوام کے تعلق کی مضبوطی کی ہلالؔ صاحب مرثیوں میں رعایت کرتے نظر آتے ہیں کہ جس سے قرطاس ہو یا منبران کے فن پارے ہر سطح پر یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔

www.emarsiya.com

دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۲۵۰ مرثیہ نگاروں کے ۳۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کر سکتے ہیں۔سوزخواں خواتین و حضرات کے لیے بستۂ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔اگر آپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پر شامل کرنا چاہیں تو اس ای میل پر رابطہ کریں۔

faroghemarsiya@gmail.com

غیر مطبوعہ مرثیہ

سیّد جاوید حسن

مصرع: اصرار ہے یہ مجھ سے کہ میں مرثیہ لکھوں

اصرار ہے یہ مجھ سے کہ میں مرثیہ لکھوں یعنی حدیثِ معرکۂ کربلا لکھوں
اور حالِ بے نوائیِ آلِ عبا لکھوں (۱) سب کچھ انیسؔ لکھ گئے اب اور کیا لکھوں
جرأت نہیں پہ دل مرا حائل ہے دوستو
دیوارِ عجز راہ میں حائل ہے دوستو

کیونکر لکھوں وہ انجمِ معجز بیاں نہیں وہ مشفق و شفیق نہیں مہرباں نہیں
وہ آشنائے مرثیہ وہ نکتہ داں نہیں (۲) وہ میرا سرپرستِ سخن اب یہاں نہیں
لیکن جو سر پہ رائیتِ عباسؑ ہووے گا
کیونکر غلام آپ کا بے آس ہووے گا

سائے میں اس علم کے میں مصرے رقم کروں خامے پہ یاعلیؑ دم تحریر دم کروں
کشتِ سخن کو فکر انیسیؔ سے نم کرو (۳) مجلس میں واہ واہ کے ساماں بہم کروں
فیضِ دبیرؔ و مونسؔ و انسؔ و انیسؔ ہو
بندش نفیسؔ ہو تو زباں بھی سلیس ہو

بے شک قدیم مرثیے صد افتخار ہیں یہ جان ہیں سخن کی سخن کا وقار ہیں
گویا شہادتوں کے چمن کی بہار ہیں (۴) بہرِ عزا عطّیۂ پروردگار ہیں
یہ آج جو رثا کے چمن میں بہار ہے
سب دامنِ انیسؔ کا گرد و غبار ہے

اجزا کا بندوبست وہ نظمِ انیسؔ میں گلہائے رنگ رنگ وہ بزمِ انیسؔ میں
تیغوں کی آب و تاب وہ رزمِ انیسؔ میں (۵) گویا تھے سارے ماجرے چشمِ انیسؔ میں
اُن مرثیوں کے فیض سے مصرعے رقم کروں
ذکرِ مصائبِ شہؑ عالی ہم کروں

خامہ چلا یہ کہتا ہوا یاعلیؑ مدد حالِ حسینؑ لکھنا ہے مولا علیؑ مدد
منزل ہے دور ، دور ہے جانا علیؑ مدد (۶) قنبرؑ سرشت ہوں مرے آقا علیؑ مدد
تفسیرِ ''ھل اتیٰ'' ہو ہمیں بھی عطا کرو
کھل جائے قفلِ لب کوئی ایسی دوا کرو

تم بابِ علم معنیٰ اُم الکتاب ہو نقطہ ہو ''با'' کا محرمِ ہر ایک باب ہو
''فزت بہ ربّ کعبہ'' کہا کامیاب ہو (۷) بعدِ رسولؐ علم کا تم آفتاب ہو
رزقِ سخن کی بھیک عطا ہو غلام کو
میں بھی سخنوروں میں گنا جاؤں نام کو

خواہش سخنوروں میں گنے جانے کی یہ کیا؟ یہ گوئے مرثیہ ہے سنبھل کر قدم بڑھا
دشتِ رِثا کی سیر کچھ آسان ہے بھلا (۸) دعویٰ سخنوری کا کجا اور تو کجا
اک بیت بھی جو زیبِ شہؑ خوش مقام ہو
ممکن ہے آخرت کے لیے انتظام ہو

لیکن یہ ڈر یہ خوف یہ وسواس کیا ضرور ہوویں گے تیرے حامی و ناصر تو خود حضور
ہاں کوئی بات شرع سے باہر نہ قولِ زور (۹) ورنہ وصالِ مرثیہ اب کچھ نہیں ہے دور
مجلس میں جب گئے غمِ تازہ اُٹھایا ہے
یاروں نے مرثیے کا جنازہ اٹھایا ہے

روئے سخن کس کی طرف ہو تو روسیاہ لیکن جدید نظم سے ممکن نہیں نباہ
نے بزم ہے نہ رزم نہ وہ ہاشمی سپاہ (۱۰) سُن کر انیسؔ بھی کہیں اللہ کی پناہ
نے تیغ ہے نہ اسپ نہ وہ شہسوار ہیں
یہ مرثیے ہماری طبیعت پہ بار ہیں

تشبیب سے گریز ہو اب مرثیہ سُنا یعنی مصائبِ شہؑ کرب و بلا سُنا
اور جانفشانیِ جریِ باوفا سُنا (۱۱) پیاسوں کی پیاس تھام کے رِقّت سنا سُنا
گوہر شناس بیٹھے ہیں اے طبع تیز ہاں
بندش ہو چُست خامہ نہ بھٹکے یہاں وہاں

اٹّھائیسویں رجب کو جو کی نظم ابتدا ناگاہ آئی ہاتفِ غیبی کی یہ صدا
لے تیرے اس سفر میں بھی مولیٰ ہیں مقتدا (۱۲) سعیِ سخن کا پائے گا ان سے ہی تو صلا
یہ مرثیہ جو تو سر منبر سنائے گا
ہر بیتِ نو پہ خلد میں اک بیت پائے گا

لو وہ چلے حضور مدینے کو چھوڑ کر سب سلسلے دیارِ محمدؐ سے توڑ کر
بس خانۂ خدا کی طرف رُخ کو موڑ کر (۱۳) ذاتِ قدُس صفات سے رشتے کو جوڑ کر
اب کربلا میں جا کے یہ بستی بسائیں گے
اُمّت کی مغفرت کے لئے گھر لٹائیں گے

کیا ابتدا سفر کی ہے کیا احتشام ہے محملِ کا بیبیوں کے لیے اہتمام ہے
عباسؑ نامدار کا سب انتظام ہے (۱۴) اکبرؑ بھی ساتھ ہیں کہ ادب کا مقام ہے
لو کارواں چلا سوئے مکّہ طواف کو
کعبہ نے احترام میں اوڑھا غلاف کو

کعبہ کا شوق دید میں دل فرشِ راہ ہے رُکن و مقام کی سوئے حضرت نگاہ ہے
زمزم ہے بے قرار کمال اُس کو چاہ ہے (۱۵) کوہ صفا کہ لب پہ بھی توصیفِ شاہؑ ہے
لیکن خبر نہیں ہے کہ ہے مختصر قیام
اغلب یہ ہے کہ کوچ کریں گے شہِؑ امام

تھا چار ماہ شاہ کا مکّے میں جو قیام در پئے تھا اُن کی جان کا فاسق امیرِ شام
کوشش یہ تھی کہ قتل یہیں ہوں شہِؑ انام (۱۶) پیشِ نظر تھا آپ کے کعبہ کا احترام
موقوف کرکے حج کو شہِؑ مشرقین نے
چھوڑا حدودِ خانۂ رب کو حسینؑ نے

ذی الحج کی آٹھویں کو چلے شاہِؑ مشرقین کنبہ رسولؐ پاک کا ہمراہ اور حسینؑ
اصحاب ہمرکاب تھے اور ساتھ نورِ عین (۱۷) بانگِ رحیل ٹھہرے وہ بنتِ نبیؐ کے بین
تھا قصہ یہ کہ کوفے کو جاکر بسائیں گے
گمراہ جو ہیں ان کو رہِ حق دکھائیں گے

طے منزلوں پہ منزلیں کرتے ہوئے چلے باطل کو راہِ حق میں بدلتے ہوئے چلے
صحرائے پُر خطر سے گزرتے ہوئے چلے (۱۸) گردِ سفر سے اور سنورتے ہوئے چلے
کیا شوق تھا حضور کو مقتل سجانے کا
اک اضطراب وعدۂ طفلی نبھانے کا

منزل تھی وہ صفاح فرزدق ملے جہاں اور پوچھا شہؑ سے اے شہِؑ والا چلے کہاں
فرمایا آپ نے کہ ہوں کوفے کا میہماں (۱۹) بولے فرزدق آپ نہ جائیں ابھی وہاں
کوفی ہیں بد سرشت و بد اعمال و طمع خو
غالب ہے یہ کہ پھیریں گے آنکھیں وہ حیلہ جو

فرمایا آپ نے کہ ھوں محرم میں راز کا سب کار آشکار ہے اس کارساز کا
اک بندۂ حقیر ہوں بندہ نواز کا (۲۰) کیونکر کہوں یہ امر ہے راز و نیاز کا
وعدہ ہے خوں میں بھرنے کا ربِّ قدیر سے (انیسؔ)
اب کیا کوئی بچائے گا شمشیر و تیر سے

تھے راستے میں شاہ کہ ہاتف نے دی صدا مارے گئے ہیں مسلمؑ و ہانیِ بے نوا
یہ سُن کے بے قرار ہوئے شاہِؑ دو سرا (۲۱) اور بعدِ ضبط گریہ یہ حضرت نے پھر کہا
پہلا یہ فدیہ پیش ہے تجھ بارگاہ میں
بندے کا دخل کیا ہے رضائے الٰہ میں

لو منزلِ شرافؔ پہ مولیٰ پہنچ گئے ہمراہ کے لے چھوٹا سا کنبہ پہنچ گئے
خوشبو ہے دشت میں گُلِ زہراؑ پہنچ گئے (۲۲) حُرؔ کا نصیب جاگے گا آقا پہنچ گئے
پہنچا جو حُرؔ شرافؔ تو کیا کیا شرف ملے
پروانہ خُلد کا ملا دُرِ نجف ملے

جب کربلا پہنچ گئے سردارِ اِنس و جاں حسرت سے دیکھا عرش نے دشتِ بلا کی شاں
بسم اللہ کہہ کے اسپ سے اُترے شہِؑ زماں (۲۳) اک باغ تھا کہ تازہ ہوا زیرِ آسماں
برپا ہوئے خیامِ شہِؑ آسماں مقام
آ پہنچے جن و انس و ملائک پئے سلام

ناگاہ اڈی ایک طرف سے سپاہِ شام کہنے لگے کہ نصب کہیں اور ہوں خیام
ہے یہ ترائی ہم کو ہے درکار یہ مقام (۲۴) حاکم کا حکم ، آب کو ترسیں شہِؑ انام
لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ملے گی جب پسرِ سعد آئے گا(انیسؔ)

سنتے ہی یہ جلال میں آیا علیؑ کا شیر پیشِ سپاہ آنے میں دم کی نہیں تھی دیر
گرجا مثالِ رعد کہ ہیں زندگی سے سیر (۲۵) مرنے کی ٹھان لی ہے تو کیا دیر کیا سویر
ہم خود ہٹائیں خیمے یہاں سے بعید ہے
فاسق ہے ابنِ سعد تو فاجر یزید ہے

ہاں تم ہٹا سکو تو ہٹاؤ کھڑے ہیں ہم پیچھے نہیں ہٹے ہیں جو آگے بڑھے ہیں ہم
بے فتح معرکے سے نہ واپس مڑے ہیں ہم (۲۶) یہ فوج کیا ہے لاکھوں سے تنہا لڑے ہیں ہم
ہم نے حیات بخشی ہے آبِ حیات کو
صحرا میں کیسے چھوڑ دیں قربِ فرات کو

یوں غیظ میں پکارے جو عباسِؑ ذی حشم صدمے سے قلب ہل گئے تھرائے سب علم
جلدی سے اُٹھ کے آگے بڑھے شاہِ خوش قدم (۲۷) اور اپنے سر کی غازی کو دی آپ نے قسم
فرمایا بھائی نہر سے خیمے ہٹایئے
اب ان کے منہ نہ لگیے مرے ساتھ آیئے

سننا تھا یہ کہ غازی نے روکے وہیں قدم پر ضبطِ جوش و غیظ میں آنکھیں ہوئیں تھیں نم
فرمایا آپ کی قسم اے سرورِؑ امم (۲۸) اس فوجِ نابکار کو کوفی تھے ایک ہم
لیکن جو حکمِ شہؑ ہے وہی سازگار ہے
حکمِ امام مصلحتِ کردگار ہے

اور تیسری تھی ماہ کی جب گھر گئے حرم آ پہونچا ابنِ سعد لیے فوجِ پر ستم
یلغار چار سمت سے تھی اور شہِؑ اُمم (۲۹) جوشِ وغا سے سرخ تھے عباسِؑ ذی حشم
کہتے تھے فوج کیسی ہے ہم کوہ ٹال دیں
اے کاش اذنِ جنگ شہِؑ خوش خصال دیں

پھر ساتویں سے ہوگیا اعدا کا اژدھام نرغے میں آگئے وہ شہِؑ آسماں مقام
اک شور تھا کہ نہر کی راہیں رکیں تمام (۳۰) پانی کی بوند بوند کو ترسیں یہ لالہ فام
اور آٹھویں سے خشک ہے گلشن بتولؑ کا
زہرہ عطش سے آب ہے سبطِ رسولؑ کا

عاشور کی سَحَر کا وہ جلوہ عیاں ہوا شُقّہ کُشا وہ مہرِ مبیں کا نشاں ہوا
تفسیرِ ''والنہار'' کی صورت جہاں ہوا (۳۱) ہر ایک فرد حمد میں رطب اللساں ہوا
سارے چراغِ انجم و مہتاب گُل ہوئے
خورشید کے عروج کے ہر سمت غُل ہوئے

کھا کر ہوا سَحَر کی اُڑے سب کے ہوش ہیں اشجار جھومتے صفتِ بادہ نوش ہیں
سر تا قدم نگارِ چمن سرخ پوش ہیں (۳۲) شاخیں پکاریں ، ہم سبدِ گل فروش ہیں
کیسے میں نقدِ جاں ہو تو پھر ہم کو مول لو
گلہائے کربلا ہیں جواہر میں تول لو

خیمے سے نکلے عالی منش ہاشمی جواں دنیا و دیں کی زینت و عزت جہاں کی جاں
حمد و ثنائے رب میں ہیں مصروف یک زباں (۳۳) ہے انتظار یہ کہ کہیں جلد ہو اذاں
سامان کریں اطاعتِ ربِّ غفور کے
باہم صفیں بنائیں عقب میں حضور کے

اتنے میں آئی ہاتفِ غیبی کی یہ صدا شب گزری اب سحر کا فریضہ کرو ادا
صف بستہ جلد ہو پئے توصیفِ کبریا (۳۴) یہ سن کے صف بنانے لگے سب وہ باصفا
لب پر تھی حمد درد و الم دل سے دور تھے
سولہ پہر کی پیاس میں چہروں پہ نور تھے

خیمے سے نکلے اپنے شہنشاہِ بحر و بر تشریف لائے قبلۂ دیں جانماز پر
بیٹھے مجاہدیں عقبِ شاہؑ نامور (۳۵) ہمشکلِ مصطفیٰؐ نے اذاں دی وہ پُر اثر
صوتِ نبیؐ سے وجد میں سب جھومنے لگے
پڑھ کر درود شاہؑ عرب جھومنے لگے

وہ آخری نمازِ جماعت وہ اس کی شاں جس کے امامؑ خود ہوئے سردارِ اِنس و جاں
وہ نور کی صفیں وہ معلّی ملک نشاں (۳۶) رفعت میں کم تھا جن کے مصّلے سے آسماں
دھوم اِس نماز کی سرِ عرشِ عُلا گئی
سجدوں سے کربلا کی زمیں تھر تھرا گئی

فارغ ہوئے نماز سے جب شاہؑ دو سرا سرکارِ حق میں ہاتھ اُٹھا کر یہ کی دُعا
تو قادر و کریم ہے اے صاحب عطا (۳۷) ہووے کرم غریبوں پہ اب بہرِ مصطفیٰؐ
اُمّت کے ظلم و جور و جفا سے نجات ہو
یارب مسافروں کو بلا سے نجات ہو

ایسے میں آئی حضرتِ فضّہ کی یہ صدا ہے ، اب تو تیر آنے لگے تا حرم سرا
خیمے میں جلد آیئے یا شاہؑ کربلا (۳۸) یہ سُن کے جانماز سے اُٹھّے شہِؑ ہدا
پردہ اٹھا کے خیمۂ عصمت مآب کا
داخل ہوا وہ نور رسالتمآب کا

داخل ہوئے تو شاہؑ نے دیکھا یہ ماجرا اہلِ حرم میں شورِ قیامت ہے اک بپا
کھولے ہیں سب نے بال ہیں زینبؑ برہنہ پا (۳۹) سجدے میں گر کے حق سے یہ کرتی ہیں التجا
تو غافر و رحیم ہے پیاسے پہ رحم کر
بہرِ نبیؐ کے نواسے پہ رحم کر

حسرت سے دیکھا شاہؑ نے چہروں کو بار بار ایسے میں آئے حضرتِ عباسؑ نامدار
بولے گلے لگا کے یہ سلطانِ ذیوقار (۴۰) لو یہ علم امانتِ محبوبِ کردگار
غازی نے سر کو فرطِ ادب سے جُھکا دیا
خم ہو کے رایتِ شہِؑ خیبر کُشا لیا

القصہ مل کے اہلِ حرم سے بہ درد و یاس نکلے حرم سرا سے امامِ فلک اساس
اور ساتھ تھے علم لیے عباسؑ حق شناس (۴۱) شیروں کے شیر قاسمؑ و اکبرؑ تھے آس پاس
اور بھانجے بھی سایہ صفت ساتھ ساتھ تھے
بل ابروں پہ نیمچوں پہ ان کے ہاتھ تھے

وہ شان وہ شکوہِ علمدار وہ علم جُھک جُھک کے چومنے لگی فتح و ظفر قدم
اک شور مچ گیا تھا سرِ وادیٔ ستم (۴۲) بھاگو کہ شیرِ بیشۂ حیدرؑ ہے ذی حشم
ہاتھوں سے جس کے مرحب وعنتر ہوئے تھے قتل
اک دو کا ذکر کیا ہے کہ لشکر ہوئے تھے قتل

آگے بڑھے وہاں سے وہ سب عاشقانِ رب کہتے تھے تیغیں نیاموں میں رکتی نہیں ہے اب
اور عرض کی یہ آپ سے کہ اے شہِؑ عرب (۴۳) دیجیے رضا تو قتل ہوں یہ شوم سب کے سب
لاشوں سے خندقیں دمِ پیکار پاٹ دیں
سرافسروں کے پیادوں کے ہم پاؤں کاٹ دیں

بولے وہ مسکرا کے شہنشاہِ ذی کرم میں دیکھتا تھا لشکرِ اسلام کا حشم
صد حیف عصر تک نہ رہیں گے نہ تم نہ ہم (۴۴) کینہ ہے ابنِ سعد کو اللہ کی قسم
ان کوفیوں کو پاسِ حمیّت ذرا نہیں
جاؤ پئے وغا میں تمہیں روکتا نہیں

پاکر کے اذن شاد ہوئے وہ خجستہ گام حملوں سے ان کے گونج گیا چرخِ نیل فام
جو پیل تن تھے موت کے آئے انہیں پیام (۴۵) لاشوں سے پٹ گیا تھا ادھر رن کا رن تمام
جاتی تھی خود اجل بھی جو فکرِ شمار میں
ملتے نہ دس جواں تھے سلامت ہزار میں

ہاتھوں میں جب رہی نہیں لڑنے کی طاقتیں ہونے لگیں تھیں غیر دلیروں کی حالتیں
لگتے تھے جب کہ زخم تو ملتی تھی راحتیں (۴۶) زندہ رہیں حسینؑ دلوں کی تھی حاجتیں
پیغامِ موت آیا سدھارے بہشت کو
چھوڑا جناں کے شوق میں دنیائے زشت کو

پھر عازمِ جہاد ہوئے ہاشمی جواں تھی جن کے دم قدم سے یہ سب رونقِ جہاں
زینبؑ کے لال مسلمِؑ مظلوم کے نشاں (۴۷) قاسمؑ سا گلبدن حسنِؑ مجتبیٰؑ کی جاں
اک ایک جوان فرد تھا شوکت میں شان میں
اُن کی وغا کا ذکر ہے اب تک جہان میں

تا دیر لڑ کے مر گئے جب وہ نکو شیم لاشے اٹھانے خود گئے پھر سرورِؑ اُمم
تھے ساتھ ساتھ اکبرؑ و عباسِؑ ذی حشم (۴۸) رُخ پر تھی خاک ہاتھ تھا سینے پہ پشت خم
چلّاتے تھے کہ گود کے پالے کدھر گئے
ہم ایسے سخت جاں ہیں کہ اب تک نہ مر گئے (انیسؔ)

لاشے جو آئے خیمے میں محشر ہوا بپا سر پیٹنے لگے حرمِ شاہِؑ کربلا
سب سے جدا تھا مادرِ قاسمؑ کا ماجرا (۴۹) دیکھا جو شاہؑ کو تو بصد رنج دی صدا
تازہ جگر میں داغِ حسنؑ آج ہو گیا
اے بھائی پھر سے گھر مرا تاراج ہو گیا

صدمے سے گم کھڑے تھے اِدھر سرورِؑ اُمم ناگاہ آئے خیمے میں عباسِؑ خوش قدم
کی دست بستہ عرض یہ شہؑ سے بہ چشمِ نم (۵۰) بے اذنِ جنگ جانے کہ یاں سے نہیں ہیں ہم
قابو میں دل نہیں گُہر مُدعا ملے
خادم کو بھی اجازتِ دشتِ وغا ملے

بولے حسینؑ خوب کہا تم نے واہ واہ دے کر کے اذن تم کو کروں اپنا گھر تباہ
تم ہو تو چیز کچھ نہیں دشمن کی یہ سپاہ (۵۱) مرجائے گی سنے گی جو زینبؑ یہ بات آہ
تم حامل علم مرے لشکر کی شان ہو
سب کے دلوں کی آس سکینہؑ کی جان ہو

بولے یہ سُن کے حضرتِ عباسِؑ ذیوقار قاسمؑ کے بعد سر مرا اب دوش پر ہے بار
اور خوف ہے عطش سے نہ مرجائیں گلعذار (۵۲) سولہ پہر کی پیاس سے بچے ہیں بے قرار
ہو اذن گر تو جا کے کروں فکرِ آب کچھ
واللہ غم سے دل کو نہیں میرے تاب کچھ

تکتے تھے شہؑ ابھی رخِ عباسؑ نامور جو خشک مشک لائیں سکینہؑ بہ چشمِ تر
کہنے لگی چچا سے یوں وہ سوختہ جگر (۵۳) عمو نہیں ہے موت سے واللہ اب مفر
سوکھے ہیں ہونٹ پیاس سے اب جی نڈھال ہے
پانی بغیر اب مرا جینا محال ہے

رونے لگے یہ سُن کے علمدارِ ذی کرم اور گود میں اٹھالیا فوراً بہ چشمِ نم
فرمایا ہے چچا ابھی زندہ ، کرو نہ غم (۵۴) اس فوجِ نابکار کو کب مانتے ہیں ہم
مشکیزہ لے کے بی بی کا دریا پہ جاتے ہیں
ہاتھوں سے اپنے بی بی کو پانی پلاتے ہیں

عباسؑ نے کہے جو سکینہؑ سے یہ سخن اِک آہِ سرد بھر کے یہ بولے شہِؑ زمن
حاصل نہیں ہے کچھ بھی کرو چاہے جو جتن (۵۵) پر جاؤ اب کہ حافظ و ناصر ہو ذوالمنن
تنہا ہوئے ہیں فوجِ مخالف کثیر ہے
آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے (انیسؔ)

ناگاہ گونجا طبل سے تب عرصۂ قتال بیٹھے دلِ عدو ، وہ اُٹھا مرتضیٰؑ کا لال
بولیں سکینہؑ آ گئی کیا فوجِ بدخصال (۵۶) عباسؑ نے کہا ابھی زندہ ہوں کیا مجال
سوئے فرس نہ سوئے خدم دیکھتے ہوئے
خیمے سے نکلے تیغ کا دم دیکھتے ہوئے

انداز رن میں آتے ہی شیرانہ ہوگیا دشتِ وغا تمام جلو خانہ ہوگیا
خورشید شمع حُسن کا پروانہ ہوگیا (۵۷) عالم نثارِ شوکتِ شاہانہ ہوگیا
دیکھا جو رعب بازوئے عالی مقام کو (انیسؔ)
علموں نے جھک کے ہاتھ بڑھائے سلام کو

تازی پہ راستے میں ابھی تھا وہ شیرِ نر تھرّا رہے تھے خوف سے کفّار کے جگر
کہتے تھے آج موت سے ممکن نہیں مفر (۵۸) بس اب تو اپنا جلد سفر ہے سوئے سقر
مہلت ملے ذرا بھی تو راہِ فرار لیں
کیونکر جری سے عمرِ دگر مستعار لیں

گھوڑا اڑا کے رن میں جو حضرت شتاب آئے اک شور تھا کہ لو شہ گردوں رکاب آئے
چلائے خیبری کہ نہیں بوتراب آئے (۵۹) یا خلد سے جنابِ رسالتمآبؐ آئے
دہشت سے نامیوں کے جگر تھر تھرا گئے
ثابت قدم بنے تھے مگر ڈگمگا گئے

تھی تیغ صاعقہ تو مثالِ ہوا فرس پایا جونہی جری کا اشارہ اڑا فرس
اترا میانِ لشکرِ اہلِ جفا فرس (۶۰) ایسی اڑان تھی کہ پری بن گیا فرس
گردن اُٹھا کے قصد فلک کا کیا کبھی
غائب ہوا نظر سے دکھائی دیا کبھی

معشوقِ شعلہ رنگ جو جرّار کی چلی کس کس تپاک سے وہ ہر اک کے گلے لگی
اعدا میں پڑ گئی تھی قیامت کی کھلبلی (۶۱) سر سے نہ وقتِ جنگ قضا ایک کے ٹلی
اللہ رے خوف بازوئے سلطانِ پاک کا
جو گر گیا زمین پہ وہ پتلا تھا خاک کا

بھاگے جو نہر سے وہ نگہبانِ بد صفات یاد آئی پھر وہ دخترِ سلطانِ کائنات
شبدیز کو اڑاتا ہوا پیکرِ ثبات (۶۲) مشکیزہ کھولتا ہوا آیا سوئے فرات
مانندِ برق تیغ کے جوہر چمک گئے
جانیں بچا بچا کے ستم گر سرک گئے

اتُرا میانِ نہر جو حیدرؑ کا آفتاب موجیں ہوئیں خجالت و خفت سے آب آب
تھیں غمزدہ کہ پیاسا ہے ابنِ ابوترابؑ (۶۳) آنکھیں جری کے پاؤں پہ ملنے لگے حباب
پانی پہ جتنا رنگ چڑھا تھا اُتر گیا
بہتا ہوا نہیب سے پانی ٹھہر گیا

بھرتے ہی مشک ہاتھ اُٹھائے پئے دُعا اور چشم تر سے کرنے لگے حق سے التجا
یارب یہ وقت سخت ہے اور رحم کی ہے جا (۶۴) ہے تین دن سے تشنہ جگر آلِ مصطفیٰؐ
اے کاش میری سعیٔ طلب کامیاب ہو
ایسا نہ ہو کہ سب مری محنت خراب ہو

صد حیف مستجاب نہ ہو پائی وہ دُعا نکلا فرات سے جو جگر بندِ مرتضیٰؑ
اک بار پھر سے تازہ قیامت ہوئی بپا (۶۵) مجمع وہ قہر کا سرِ ساحل نظر پڑا
چلتے چہار سمت سے تھے بار بار تیر
زخمی وہ ایک شیر کہاں بے شمار تیر

تیروں سے صدرِ پاک جو غربال ہوچکا اُسی لمحہ ہائے تب بنِ ورقہ نے کی جفا
سر پر لگا وہ گرزِ گراں وا مصیبتا (۶۶) تر ہو گیا لہو سے بنِ ضیغمِ الٰہ
غم درد و یاس آکے قدم چومنے لگے
ہو کر نحیف اسپ پہ تب جھومنے لگے

اس پر بھی رحم کھا کے نہ اہلِ جفا ہٹے تن پر سنانین کھائیں تو سب خون میں بھرے
سب ولولے وہ جنگ کے دل میں جو تھے گئے (۶۷) تیغوں سے ہاتھ ابنِ یداللہ کے کٹے
رُخ سوئے خیمہ گاہ ہے آنکھوں میں اشک ہے
ٹھنڈا علم زمین پہ ہے دانتوں میں مشک ہے

چلّاتے تھے یہ کوفی و شامی پرے جمائے ہشیار باش خیموں میں پانی نہ جانے پائے
یہ سن کے تیر فوجِ بد انداز نے لگائے (۶۸) مجبوریوں کے اشک علمدار نے بہائے
بازو کے قطع ہونے کا بھی گو الم ہوا
مشکِ سکینہؑ چھد گئی دھرا ستم ہوا

پشتِ فرس سے ریت پہ آیا جو شہسوار کس یاس سے جری نے پکارا پھر ایک بار
آقا تمام ہوتا ہے یہ عبدِ جانثار (۶۹) لیجیے خبر غلام کی اب بہرِ کردگار
قابو میں گو نہیں یہ دلِ ناصبور ہے
چوموں قدم کو آخری حسرت ضرور ہے

سُن کر صدا ترائی کو گریاں چلے حسینؑ رکھّے قبا کا آنکھوں پہ داماں چلے حسینؑ
بے تاب سوئے صفدرِ ذیشاں چلے حسینؑ (۷۰) تھامے جگر کو چاک گریباں چلے حسینؑ
اندھیرا چار سو جو تھا ٹھکرا کے گرتے تھے
ہر ہر قدم پہ ضعف سے غش کھا کے گرتے تھے

چلّاتے تھے کہ بھائی میں آیا کدھر ہو تم ہم جاں بلب قلق سے ہیں اور بے خبر ہو تم
نرغے میں اہلِ ظلم کے بے بس اگر ہو تم (۷۱) پروا نہ کیجیو کہ علیؑ کے پسر ہو تم
صدمے سے حال قلب و جگر کا عجیب ہے
تم سے شکستہ حال مگر اب قریب ہے

پہنچے ترائی میں جو بہ مشکل شہِؑ زمن زخمی پڑا تھا خاک پہ جرّار صف شکن
بالیں پہ جا کے بیٹھ گئے شہؑ بصد محن (۷۲) فرمایا دل پکڑ کے یہ حسرت مرا سخن
مغموم و دل شکستہ و ناچار آیا ہے
آنکھوں کو کھولو بھائی کہ غمخوار آیا ہے

غش میں سنا جو گریہ شاہنشہِ ہدا دیکھا رخِ حسینؑ کو باچشمِ نیم وا
تقدیر کے بگاڑ کا کرنے لگے گلہ (۷۳) فرمایا آپ نے کہ مشیّت میں دخل کیا
تم نے عزیز جان سے نعمت کو کب کیا
جو کچھ وفا کا حق تھا ادا تم نے سب کیا

یہ کہہ کے چُپ ہوئے جو شہنشاہِ سرفراز سر کو پٹک پٹک کہ یہ بولا وہ نامدار
تیروں سے مشک چھد جو گئی وقتِ کار زار (۷۴) ہے دل میں یہ غلام سکینہؑ سے شرمسار
خیمے میں میری لاش نہ لے جایئے گا آپ
خادم کو اس ترائی میں دفنایئے گا آپ

اتنا ہی کہنے پائے تھے عباسؑ نوجواں آثارِ موت چہرے سے ہونے لگے عیاں
آنے لگیں وہ نزع کے عالم کی ہچکیاں (۷۵) نکلا قفس سے چھوٹ کے پھر عندلیبِ جاں
اب کیا کہوں کہ نظمِ دو عالم اُلٹ گیا (انیسؔ)
ہیہات زورِ بازوئے بشیرؑ گھٹ گیا

اب مرثیہ تمام ہے جاویدؔ کر دُعا فرمائشوں پہ جن کی ہے یہ مرثیہ کہا
ضیغمؔ و حمزہؔ طحٰہؔ و خضرؔ خجستہ پا (۷۶) آباد و شاد اِن کو ہمیشہ رکھے خدا
بخشش ھو مغفرت ہو مرے والدین کی
ہے جن کی تربیت یہ محبّت حسینؑ کی

میر انیسؔ کی سلام گوئی اور اس کا مزاج

سید بصیر الحسن وفاؔ نقوی

سلام اردو ادب کی وہ صنف ہے جس کی ہیئت غزل کی مانند ہوتی ہے لیکن اس کا مزاج غزل سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جو مجلس میں پیش خوانی کے بطور منبر پر پڑھی جاتی ہے اور سامعین کے لیے مرثیہ یا تقریر سننے کے لیے مانوس فضا قائم کرتی ہے۔ ہر دور کے نامور اور بڑے شعراء نے اس کے توسل سے امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے لیے اپنا اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ساتھ ہی اس صنف کو محدود دائروں سے نکال کر عوام تک پہنچایا اور اس کو اس لائق کیا کہ آج اردو ادب میں سلام کی منفرد حیثیت نظر آتی ہے۔

سلام کو محدود دائروں اور زاویوں سے نکالنے کے لئے میر انیسؔ نے جو عمل انجام دیا اس کو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ان کا مقام مرثیہ نگاری میں کیا ہے لیکن ان کے سلاموں کا مطالعہ کریں تو دیکھنے کو ملتا ہے کہ انھوں نے سلام کی صنف کو بھی منزلِ کمال تک پہنچایا۔ ان کے کلام کا خاصہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سلام کو مرثیہ کے دامن کی طرح وسعت بخشی اور نہ جانے آج تک کتنے ادباء و شعراء ان کے سلاموں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے سلاموں کو محض رثائیت تک ہی نہیں رکھا بلکہ ان میں وہ تمام عناصر یکجا کر دیئے جو بڑی شاعری کے لیے ضروری تھے۔

اسلام کے ماننے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے وحدہ لاشریک یعنی اللہ تبارک تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے کیوں کہ انسان کا لمحہ لمحہ اور ذرہ ذرہ اس کا رہینِ منت ہے۔ وہ چاہے شاعری ہو یا نثر ہو یا انسان کی ذاتی زندگی اگر انسان باظرف اور اپنے معبود کی معرفت رکھتا ہے تو اس کی توصیف بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس پس منظر میں ہم میر انیسؔ کے سلاموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے یہاں قدم قدم پر سلاموں میں حمدِ باریِ تعالیٰ کے نقوش نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

اسی کا نور ہر اک شئے میں جلوہ گر دیکھا
اُسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا

یعنی انیسؔ کا مزاج جہاں حمد و ثنا کی طرف مائل ہے وہیں ان کی حمد سے متصوفانہ انداز اور فکر بھی جھلکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ذرے سے خدا کی قدرت عیاں ہے جسے تصوف کی رو سے ''وحدۃ الوجود'' کے آئینے میں دیکھا جاتا ہے۔

چونکہ اللہ منصف ہے اور کسی پر ظلم نہیں کرتا اور کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا تو اس بات کا اعتراف بھی حمد ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ میر انیسؔ کہتے ہیں:

دولت اِس کو دی قناعت کی تو اُس کو زر دیا
لطف اُس عادل کا یکساں ہے گدا و شاہ پر

وہ قناعت کو پسند کرتے ہیں اور کنجِ عزلت میں بھی اپنے رازق کی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں اور کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں

کرتے۔اشعار ملاحظہ کریں:

گردش عبث ہے کنجِ قناعت میں بیٹھ رہ
رازق نے رزق خلق کیا آسیا کے ساتھ

کنجِ عزلت میں مثالِ آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے

کسی کے سامنے کیوں جاکے ہاتھ پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

اس کے علاوہ وہ اللہ کے علم کی بھی تعریف کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ وہ علم کا خالق ہے۔شعر ہے:

علمِ خالق کا خزانہ ہے میانِ کاف و نون
ایک ''کُن'' کہنے سے یہ کون و مکاں پیدا ہوئے

اسی طرح وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ حسن و جمال کو پسند کرتا ہے اور اس نے اپنی قدرت سے کائنات میں حسن و جمال کا دریا بہا دیا ہے اب جو پاک بین ہوگا ہے وہ حسین ودلکش مناظر کو دیکھ کر اللہ کی توصیف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔شعر ہے:

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

وہ معبود کی رحمت کا بھی اپنے سلاموں میں ذکر کرتے ہیں اور اس کی رحمتوں کی فراوانی دیکھ کر اپنے اعمال پر پشیمان ہوتے ہیں۔شعر ہے:

بہانہ ڈھونڈتی ہے بخشش اے گنہ گارو!
خدا نے رحم کیا جب مجھے حجاب آیا

میر انیسؔ اپنے سلاموں میں اللہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی توصیف بھی بیان کرتے ہیں یعنی ان کے سلاموں میں نعتیہ عناصر بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔کہتے ہیں:

ہم ان کا بحرِ مصیبت میں نام لیتے ہیں   جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو تھام لیتے ہیں
سحر کو اٹھ کے زباں سے یہ کام لیتے ہیں   خدا کے بعد محمدؐ کا نام لیتے ہیں

یعنی رسول اللہ مصیبت سے نجات دلانے والے اور انسان کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچانے والے ہیں اس لیے ان کا ماننے والا سحر میں پہلے خدا کی ثنا کرتا ہے اور اس کے بعد رسولؐ اللہ کا ذکر کرتا ہے۔

ان کے یہاں معراجِ رسولؐ کا بھی خوبصورت بیان نظر آتا ہے۔کہتے ہیں:

اللہ اللہ قربِ معراجِ رسولؐ
دو کماں سے فرق ادنیٰ رہ گیا

یہاں لفظ ادنیٰ کا الگ ہی لطف ہے۔جس سے قوسین وادنیٰ کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ لفظ کسی فاصلے کے کم ہونے کی بھی بات کرتا ہے۔

انیسؔ رسول اللہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنے سلاموں میں حضرت علیؑ کا تذکرہ بھی جگہ جگہ کرتے ہیں۔وہ خانۂ خدا میں ان کی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علیؑ کو حق نے اتارا تو عین کعبے میں
کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا

یعنی حضرت علیؑ کی فضیلت یہ ہے کہ ان کو خدا نے اپنے گھر میں اتارا اور جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے خدا کا گھر ہی دیکھا۔

وہ حضرت علیؑ کو عدالت اور انصاف میں یکتا اور بے مثال جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمانے میں ان سا کوئی عادل نظر نہیں آتا کیوں کہ ان کی حکومت میں کسی کے ساتھ ظلم نہیں ہوتا۔شعر ہے:

علیؑ سا بھی نہ کوئی عادلِ زمانہ ہوا
کہ ایک باز و کبوتر کا آشیانہ ہوا

ان کا خیال ہے کہ جس شخص کے رہنما حضرت علیؑ ہوتے ہیں وہ کبھی بھٹک نہیں سکتا اور خضرؑ بھی ان کی رہبری پر قربان نظر آتے ہیں۔شعر ہے:

خضرؑ قرباں ہیں سلوکِ حیدرِؑ ذی جاہ پر
پھر نہ بھٹکا وہ ،جسے لائے خدا کی راہ پر

انیسؔ حب حیدرؑ کو آخرت میں نجات کا باعث اور گناہوں کے معاف ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔کہتے ہیں:

حبِّ حیدرؑ چاہئے کیسی خطا ، کیسے گناہ
بخش دینا جرم کیا دشوار ہے اللہ پر

ذکرِ خدا، ذکرِ رسول اور ذکرِ حضرت علیؑ کے علاوہ انیسؔ کے سلاموں میں بے ثباتیِ کائنات، فلسفۂ کائنات، تصوف، حوصلہ، عزم، دنیا کے مصائب، گناہوں سے گریز، نصیحتیں، خوفِ عصیاں، انکساری کے ساتھ اپنی تعریف بھی نظر آتی ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر ، سرا میں آکے چلے

شباب تھا کہ دمِ واپسیں کی آمد و شد
یہ مضطرب ادھر آیا ، ادھر روانہ ہوا

جو آبرو کا ہے طالب تو کر عرق ریزی
یہ کش مکش ہوئی تب پھول سے گلاب بنا
کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر
جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

بزم میں دوست بھی ہیں دشمن بھی
کون سا گل ہے جہاں خار نہیں

اپنی زباں سے پوچھ خموشی کی لذتیں
جاہل سے اعتراض پہ جھگڑا نہ چاہئے

لحد میں سامنے جب دفترِ حساب آیا
گناہ دیکھ کے کیا کیا مجھے حجاب آیا

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ان تمام مضامین کی شمولیت کے ساتھ ساتھ سلاموں کا اصلی جز ورثائیت ہی ہے شاعر مختلف وادیوں کی سیر کرتا ہوا شہدائے کربلا کے مصائب کے تحت اپنے اشعار میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔میر انیسؔ نے جہاں اپنے مراثی میں رثائیت کو انفرادیت بخشی ہے وہیں سلاموں میں بھی ان کا یہ پہلو اپنی مثال آپ ہے۔وہ اپنے سلاموں میں بھی شدتِ غم اور رثائی جذبات کی بہترین عکاسی کرتے ہیں جس سے مجلس میں گریاوبکا کا ماحول بن جاتا ہے۔

چونکہ سلام مجلس کے آغاز میں پڑھے جاتے ہیں جس سے مجلس کی فضا گریازاری کی طرف آمادہ ہو سکے۔اسی لئے شعراء نے سلاموں کے مطلعوں اوران کے درمیان میں جگہ جگہ ایسی فضا قائم کی ہے جس سے سلام کا اصل مقصد یعنی گریاوزاری ظاہر ہو سکے۔میر انیسؔ اس سلسلے سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ان کے سلاموں کے بعض مطلع ایسے ہیں جن سے سامعینِ مجلس براہِ راست گریاوزاری پر آمادہ ہونے لگتے ہیں۔مثلاًایک سلام کا مطلع ہے:

آکے جو بزمِ عزا میں رو گئے
مجرئی وہ فردِ عصیاں دھو گئے

ظاہر ہے اس مطلع میں گریاوزاری کے لئے فضا تیار کی جارہی ہے لیکن انیسؔ کا کمال ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس فضا کو تیار کرنے کے لئے انسانی فطرت کا سہارا لیتے ہیں یعنی انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ جو عمل انجام دیتا ہے اس سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہے۔انیسؔ یہاں بزمِ عزامیں گریاوزاری کوعصیاں کی تخفیف کا باعث مانتے ہیں۔

ان کے یہاں کربلا میں رونما ہونے والے مشہور واقعات وشہدا کا تذکرہ منفرد انداز میں ملتا ہے۔مثلاً امام حسینؑ جب کربلا میں وارد ہوئے توانھوں نے سب سے پہلے کربلا کی زمین کوخریدا تا کہ وہ سرزمین ان کی ملکیت ہو سکے۔انیسؔ اس واقعے کواس طرح بیان کرتے ہیں:

جگہ مول لی ہے مزاروں کی خاطر
زمیں پر شہِؑ دیں نشاں کھینچتے ہیں

حرؑ پہلے لشکرِ یزید میں تھے لیکن صبحِ عاشور وہ امام حسینؑ کے لشکر میں شامل ہو گئے اور ان کی آمد پر خود امام حسینؑ نے ان کا استقبال کیا۔اس واقعے کو انیس استعاروں کی صورت میں بیان کرتے ہیں:

حسینؑ و حرؑ کی ملاقات تھی کہ عالمِ نور
ادھر سے ماہ بڑھا تھا کہ آفتاب آیا

کربلا کی تاریخ گواہ ہے کہ نہرِ فرات کے قریب امام حسینؑ کو پیاسا رکھا گیا اور پیاسا ہی شہید کر دیا گیا۔ یہ غم اور یہ تکلیف کوئی معمولی نہیں کہ نواسۂ رسولؐ کے ساتھ یہ عمل انجام دیا گیا۔انیس کہتے ہیں:

بیکسی کی شہ کا چرچا رہ گیا
مجرئی مہمان پیاسا رہ گیا

امام حسینؑ کے خانوادے نے بھی کربلا کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جامِ شہادت پیش کیا جس میں حضرت علیؑ اکبر کا نام سرِفہرست ہے جو شبیہِ رسولؐ تھے اور سینے پر برچھی کھا کر شہید ہوئے۔شعر ہے:

زخم کھاتے ہی جو اکبرؑ گر پڑے
چھد کے برچھی سے کلیجہ رہ گیا

اس کے علاوہ حضرت علی اصغرؑ کا بھی کردار ناقابلِ فراموش ہے جنھوں نے انتہائی کمسنی یعنی صرف چھ مہینے کی عمر میں حرملہ کا تیر کھا کر دینِ حق پر جان قربان کی۔انیس کہتے ہیں:

تیر گردن پر جو کھایا دھوپ میں
بھر کے ٹھنڈی سانس بچا رہ گیا

شعر میں حسن یہ ہے کہ جہاں دھوپ کا ذکر کیا گیا ہے جو گرمی سے مشتق ہے وہیں اس کے برعکس 'ٹھنڈی سانس' کی ترکیب قبلِ تعریف ہے۔

حضرت قاسمؑ بن حسنؑ بھی کربلا کے شہداء میں ممتاز ہیں۔انھیں سلاموں اور مراثی میں دولھا بھی کہا جاتا ہے۔انیس کہتے ہیں:

غل ہوا لو کٹ گیا دولھا کا سر
بیاہ کا سامان ہوتا ہی رہا

حضرت امام حسینؑ کے بھائی اور فوج کے سپہ سالار حضرت عباسؑ ابنِ علیؑ کا کردار بھی کربلا میں ایسا ممتاز تھا کہ جن کے لئے امام حسینؑ اور ان کا خانوادہ جہاں احترام وعزت کے پھول نچھاور کرتا تھا وہیں وہ شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ خانوادۂ رسول کے لئے اس بات کا یقین بھی تھے کہ ان کے رہتے کسی کے سر سے ردا نہیں چھن سکتی۔انھیں پانی لینے کے لئے دریا پر بھیجا گیا۔انیس کہتے ہیں:

نہر میں عباسؑ داخل ہو گئے
مشورہ اعدا میں ہوتا ہی رہا

شہادتِ امام حسینؑ کے بعد فوجِ یزید خیامِ حسینی میں در آئی اور مخدراتِ عصمت کے سروں سے چادریں چھین کر انھیں برہنہ یعنی بے کجاوہ اونٹوں پر بٹھایا گیا۔انیس کہتے ہیں:

برہنہ اونٹوں پہ سیدانیاں تھیں بلوے میں
وہ دیکھتے تھے تماشا ، جنھیں حجاب نہ تھا

امام حسینؑ کی بہن جنابِ زینبؑ بنتِ علیؑ کو دربارِ کوفہ وشام میں بے ردالے جایا گیا اوران کا کوئی احترام نہ کیا گیا۔شعر ہے:

غضب کی جا ہے کہ دربار میں ستمگر کے
کھڑی تھی بنتِ علیؑ اور کچھ حجاب نہ تھا

اسی طرح بیارِ کربلا حضرت امام زین العابدین یعنی علیؑ ابن الحسینؑ کو اسیر کر کے ظالموں نے جو ظلم کئے انھیں بھی شعراء نے قدم قدم پر بیان کیا ہے۔انیسؔ ان کے غم میں ڈوب کر کہتے ہیں:

کہتے تھے عابد اٹھیں کیوں کر قدم
اے ستم گارو! نحیف و زار ہوں

دم بدم کھینچو نہ میرے ہاتھ کو
پاؤں بڑھ سکتے نہیں ناچار ہوں

میں پیادہ ، تم ہو گھوڑوں پر سوار
کس طرح دوڑوں بہت بیمار ہوں

ہمارے رثائی ادب میں جنابِ صغرا بنت الحسینؑ کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے امام حسینؑ ان کو کربلا لیکر نہیں آئے تھے۔وہ مدینے میں امام حسینؑ اوراپنے خانوادے کے افراد کی یاد میں تڑپتی رہیں یہاں تک کہ امام حسینؑ کی شہادت ہوگئی۔انیسؔ ان کے کرب کا اس طرح بیان کرتے ہیں:

شب آئی جب تو یہ نانی سے کہتی تھی صغرؑا
کہ دم الجھنے لگا وقتِ اضطراب آیا

نہ موت آتی ہے مجھ کو نہ نیند آتی ہے
اجل کو آئی اجل ،خواب کو بھی خواب آیا

میر انیسؔ کے سلاموں کے حوالے سے طویل گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن مختصر کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سلام کو غزل کے برابر لاکر کھڑا کر دیا۔جو صنف پہلے محدود ومخصوص تھی جس میں وسعت کی بہت کم گنجائش تھی جسے صرف رثائی حد تک سمجھا جاتا تھا انیسؔ نے اس کو نہایت وسعت بخشی اس میں حمدیہ،نعتیہ،منقبتیہ عناصر کے ساتھ ساتھ دنیا و مافیہا کے تقریباً تمام سائل جوان کے وقت میں رونما تھے انھیں لانے کی کوشش کی۔ساتھ ہی اس میں رعایتِ لفظی،استعارات وتشبیہات اور رعایتِ لفظی سے بھی خوب کام لیا تاکہ آنے والی نسلیں یہ سمجھ سکیں کہ سلام نگاری کا اصل فن کیا ہے۔

سلام

اخترآصف زیدی

ایک پرانی طرح میں۔۔ مصرع تھا:

"مشعلِ حبِّ علیؑ محفل میں لیکر آئے ہیں"

بزمِ غم میں ہم کو لایا ہے مقدّر آئے ہیں
یہ بتادیں، گھِر کے طوفانوں سے لڑکر آئے ہیں

ہم علیؑ والے نہیں رُکتے، ہماری راہ میں
کتنے صحرا آئے ہیں ، کتنے سمندر آئے ہیں

ہم یہاں سے ڈھونڈ لیں گے کربلا کے ماتمی
"مشعلِ حبِّ علیؑ محفل میں لیکر آئے ہیں"

کچھ غرض اُنکی یقیناً ہے، درِ حیدرؑ پہ جو
مصطفٰؐ سے پُوچھ کر، قرآن و کوثر آئے ہیں

وہ ، جنہیں قرآن کافی تھا ، وہ بعدِ مصطفیؐ
ہاتھ جوڑے مرتضیٰؑ کے در پہ اکثر آئے ہیں

مرتضیٰؑ کی تیغ تھی ہر وار میں عادل رہی
مرحب و عنتر کے حصّے بھی برابر آئے ہیں

مسکرا کر ذوالفقارِ حیدریؑ کہتی تھی۔۔ ہاں
ہم نے دیکھا ہے، مَلَک کے بھی، بہت پر آئے ہیں

شیر جیسی زندگی گزری ، تو اِنکی نسل میں
اکبرؑ و عبّاسؑ و قاسمؑ۔ عَونؑ و جعفرؑ آئے ہیں

اِنکے بچّوں کو مِلیں فردوس کی سرداریاں
اِنکی زوجہ کے لیے جنّت سے زیور آئے ہیں

وجہِ دق اُلباب پر فِضّہ سے کہتے تھے مَلَک
جاؤ بی بی کو بتا دو گھر کے نوکر آئے ہیں

کوئی اتنا تو بتا دیتا امیرِ شام کو
کربلا میں وارثانِ تیغِ حیدرؑ آئے ہیں

ہم درِ مولودِ کعبہ پر ، اکیلے تو نہیں
دیکھیے آصِف، مہ و خورشید و اختر آئے ہیں

مرثیہ بعنوان خاصانِ خدا

ڈاکٹر ناشرؔ نقوی

(۱)

اے مالکِ کل ، رزقِ سخن تو نے دیا ہے — بے سوت کو ، گویائی کا فن تونے دیا ہے
اظہار کے پھولوں کا چمن تو نے دیا ہے — کچھ بولنے ، کہنے کو دہن تو نے دیا ہے
اعجاز ہر اک شے میں دِکھایا ہے تو تو نے
ذرّات کو مرجان ، بنایا ہے تو تُو نے

(۲)

اوّل بھی ہے ، آخر بھی ہے ، مقدوم بھی تُو ہے — واحِد بھی ہے ، قادر بھی ہے ، مخدوم بھی تُو ہے
قدوس بھی ، فانوس بھی ، قیوم بھی تُو ہے — معدوم بھی ، معلوم بھی ، مقسوم بھی تُو ہے
ہر شے جو نظر آتی ہے ، تفہیم ہے تیری
تسبیح کے ہر دانے میں ، تعظیم ہے تیری

(۳)

جس درجہ بھی اوصاف ہیں ، وہ تیرے وظائف — بخشش کے لیے بھیجے ہیں ، تُو نے ہی صحائف
یہ انجمن آرائیاں ، یہ سارے لطائف — یہ چاند ، یہ سورج ، یہ ستارے ، یہ تحائف
سب روشنیاں،تیرے ہی ، الطاف و کرم کی
حد کوئی مقرر ہی نہیں ، ناز و نعم کی

(۴)

الہادی و القائم و النور و معلیٰ — الباسط و الرازق و الواسع و اعلیٰ
الرافع و المغنی و العدل و مجلی — المقتدر و والی و الحی و تجلیٰ
اسماء کے الفاظ میں تقدیس ہے تیریٰ
ہر حرف میں اک درس ہے، تدریس ہے تیری

(۵)

اے عاطف و اعلیٰ ، ترے الطاف پہ سجدے — اے واقف و ہاتف ، ترے اطراف پہ سجدے
اے عارف و شارف ، ترے انصاف پہ سجدے — اے واصف و آصف ، ترے اوصاف پہ سجدے
صد شکر کہ ، جینے کا یہ انداز دیا ہے
انسان بناکر ہمیں ، اعزاز دیا ہے

(۶)
انسان بھی ایسا کہ جو ، محبوب کا محبوب مرضیِ الٰہی کی طلب کے لیے مطلوب
یہ لطف و عنایات ، بہ فضلِ شہِؑ یعسوب سب نعمتیں ، پیغمبرِؐ حق سے رکھیں منسوب
رکھّا ہے تعلق نہ زمانے میں کسی سے
وابستہ کیا تُو نے فقط ، اپنے نبیؐ سے

(۷)
اک ایسا نبیؐ ، لہجے سے، جو طُرّۂ دستار اک ایسا نبیؐ ، رشکِ چمن ، ابرِ گہر بار
اک ایسا نبیؐ، سارے نبیوں کا جو سردار اک ایسا نبیؐ، رحمتِ کُل، سب کا مددگار
ہر قسم کی تاریکی سے ، جو دُور رہا ہے
بس نُور، فقط نُور، فقط نُور رہا ہے

(۸)
جو مرضیِ حق ہے ، وہ تمنائے محمدؐ دنیائے خداوند ہے ، دنیائے محمدؐ
معراج میں کس اوج پہ ہیں ، پائے محمد تشریح سے بالا ہیں ، سب اسمائے محمد
ہر کنّیت و نام سے ، محمود کا رشتہ
جو قول ہے ، اُس قول کا معبود سے رشتہ

(۹)
تخلیق کے اجماع میں چیدہ ہے محمدؐ گنجینۂ اوصافِ حمیدہ ہے محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا جریدہ ہے محمد قرآن کے پاروں میں قصیدہ ہے محمد
سرمایۂ توحید کا ، بے مثل امیں بھی
وہ خاک نشیں بھی ہے ، اور افلاک نشیں بھی

(۱۰)
عنوانِ وحی ، کُن کی صداقت ہے محمدؐ عِلم و نظر و ذہن و بصیرت ہے محمدؐ
ہونٹوں سے ادا ہو ، تو حلاوت ہے محمد آدابِ تکلّم کی ، وضاحت ہے محمد
دو میموں میں رکھّا ، اسے خلّاقِ جہاں نے
بوسے دیئے ، اس نامِ محمدؐ کو زباں نے

(۱۱)
اک سلسلۂ خیر ہے ، سلطانِ اُممؐ کا سر جھکتا ہے ، اِس نام پہ ، قرطاس و قلم کا
الہام ہی ، کلمہ رہا ، توقیرِ حرم کا سایہ ہے زمانے پہ ، محمدؐ کے علَم کا
ہاتھوں پہ اُٹھائے ہوئے ، خالق کا ولی ہے
اک ایسا علَم ، جِس کا علَم دار علیؑ ہے

(۱۲)
احسان ہے ، اللہ و محمدؐ کا یہ ہم پر ہم جیسے کہاں ، اور کہاں ، سایۂ حیدرؑ
وہ ذاتِ علیؑ ، ہاتھوں میں ہیں ، جس کے مقدّر بے زر پہ کرم کردے ، تو بن جائے ابوذرؓ
اُٹھا ہُوا سر کعبے کا، جِس کے لیے خم ہے
آمد سے ہی دنیا میں ، جو مولودِ حرم ہے

آئینۂ ظاہر کی مثالوں میں، علیؑ ہے   آئندہ زمانے کے سوالوں میں ، علیؑ ہے
ہر لحظہ ، پیمبرؐ کے خیالوں میں، علیؑ ہے (۱۳) وحدت کے چراغوں میں ، اُجالوں ، میں علیؑ ہے
ہے نہج و روش لہجے کی، معراجِ بیاں سے
اللہ بھی بولا ہے، علیؑ ہی کی زباں سے

الہام و احادیث کے معانی میں ، علیؑ ہے   قانونِ شریعت کی کہانی میں ، علیؑ ہے
تہذیبِ سخاوت کی روانی میں ، علیؑ ہے (۱۴) ہر ایک جگہ فیض رسانی میں ، علیؑ ہے
کوئی نہ سمجھ پایا ، امامِؑ ازلی کو
جانا ہے بس اللہ و محمدؐ نے علیؑ کو

دشوار مراحل میں سہارا بھی ، علیؑ ہے   تعویذِ گلو ، سینۂ زیبا بھی، علیؑ ہے
مُشکل میں ، ہر اک غم میں، مداوا بھی، علیؑ ہے (۱۵) سب جس کے طلب گار، وہ مولا بھی، علیؑ ہے
سب مُشکلیں ،ٹل جاتی ہیں ، اِمدادِ علیؑ سے
گر گر کے سنبھل جاتے ہیں ، ہم نادِ علیؑ سے

خالق کے شبستانوں سے نسبت ہے علیؑ کی   تخلیق میں ، عقبیٰ میں ، ہدایت ہے علیؑ کی
ہر عِلم کی تفسیر ، امامت ہے علیؑ کی (۱۶) وحدت کی گواہی میں شہادت ہے علیؑ کی
خود میں ہے جو الہام شناور ، وہ علیؑ ہے
جو چودہ چراغوں کا ہے محور، وہ علیؑ ہے

سب حُجّتِ حق ، پنجتنِؑ پاک میں اعلا   ہر ایک نے، اسرارِ مشیّت کو سنبھالا
حسنینؑ کو آغوش میں، زہراؑ نے ہے پالا (۱۷) ہے زیرِ کِسا، نورِ محمدؐ کا اجالا
ہر رشتے کی تعظیم ہے ، توقیر ہے زہراؑ
پاکیزہ ہے اس درجہ کہ تطہیر ہے زہرا

خاتونِ قیامت ہے ، فضیلت میں نِسا ہے   ہر نور میں پوشیدہ بھی اور جلوہ نما ہے
آیاتِ خداوند میں، یہ نطقِ جزا ہے (۱۸) تکمیلِ عبادت بھی ہے ، تسبیح و دعا ہے
پیغمبرؐ و حیدرؑ کے لیے ، راحتِ جاں ہے
مصدر ہے رسالت کا، امامین کی ماں ہے

بیٹی ہے پیمبرؐ کی ، یہ عصمت کا ہے پرتو   کعبہ ہو، مدینہ ہو، سبھی اس کے قلمرو
ہر گوشہ ء عصمت میں ہے خاتونِ جناں ضو (۱۹) ہر خانۂ تقدیس کے فانوس کی یہ لو
معراجِ محمدؐ کا یہ تحفہ ہے، عطا ہے
یہ عقدہ کُشا کے لیے ، اعجازِ خدا ہے

(۲۰)

سائے میں رکھا پنجتنِؑ حق کو کِسا نے
محفوظ و سلامت کیا، زہراؑ کی عطا نے
پہچان الگ سب کی کرائی ہے خدا نے
اللہ کے اسرار کو اللہ ہی جانے
پیغمبرِ اسلام کی ، بیٹوں کی، علیؑ کی
زہراؑ ہی تعارف رہی ، ایک ایک ولی کی

(۲۱)

یہ فخرِ نسا بھی ہے، یہ خاتونِ جناں ہے
والی ہے یہ چادر کی، یہ پردے کا نشاں ہے
عزت ہے خدیجہؑ کی، نساء دوجہاں ہے
بس اتنا ہی کافی ہے، یہ حسنینؑ کی ماں ہے
حسنینؑ بھی وہ لعل ،کہ جو درِّ نجف ہیں
پیغمبرؐ توحید کا اعزاز و شرف ہیں

(۲۲)

اک لعل حسنؑ، صبر و قناعت میں جو مشّاق
جو خُلق میں ہے، اوّل و ما خلق کا مصداق
جھک جاتے ہیں جس کے لئے تاریخ کے اوراق
جس کی ہے ہر اک صلح پہ، انوار کا اطلاق
اُس کی تو شکیبائی بھی ہیرے کی کنی ہے
ہونٹوں کی خموشی میں بھی خیبر شکنی ہے

(۲۳)

ہے نامِ حسنؑ خود میں ہی اک حُسن کا معیار
سرکارِ رسالت کی تمناؤں سے سرشار
چوُمے ہیں حدیثوں نے بہت پیار سے رخسار
زہراؑ کے لیے دُرِ نجف، گوہرِ شہوار
اک ذات میں، اک مدرسہ، ایمان و اذاں کا
ایثار سے معیارہے ، یہ امن و اماں کا

(۲۴)

صدقے ہے وحی ، جس کے حسب اور نسب پر
ہے حُسن فدا ، سبطِ پیمبرؐ کے لقب پر
دروازۂ جنت ہوئے وا، جس کی طلب پر
ایثار ہے چھایا ہُوا ، اوراقِ ادب پر
اِس کے بھی لیے صلِّ علیٰ ، صلِّ علیٰ ہے
یہ پنجتنی پھول ہے جو جزوئے کِسا ہے

(۲۵)

اے مالکِ عالم ، ترا احسان و کرم ہے
جو شُکر و مباہات ادا ہم سے ہو کم ہے
ہر اہلِ کِسا سید و معصوم و نعم ہے
شبرؑ سا ہی شبیرؑ ہے جو شاہِ امم ہے
وابستہ رکھا اِن سے ، کیا دوُر بلا کو
ہم سب کے لیے کھولا گیا، بابِ عطا کو

(۲۶)

خود ربِّ جہاں ، پنجتنِ پاکؑ پہ قرباں
پیغمبرِ اسلام ہوئے ، فخرِ رسولاں
زہراؑ و علیؑ ، سبز قبا ، خلق بداماں
لیکن ہے حسینؑ ابنِ علی سب سے نمایاں
بے لوث پرستار ،کسی کے بھی نہیں ہیں
شبیرؑ سے انصار کسی کے بھی نہیں ہیں

شبیرؑ پیمبرؐ کے لیے دُرِ نجف ہے شبیرؑ گہر بار ہے ، موتی ہے ، صدف ہے
شبیرؑ تو استادِ ملائک کا خلف ہے (۲۷) شبیرؑ کرم کیش دعاؤں کا شرف ہے
خالق بھی نہیں کرتا ہے اِنکار ، عطا سے
اولاد وہ غیروں کو بھی دیتا ہے دعا سے

شبیرؑ ہے ، تدوینِ احادیث میں ، یکتا شبیرؑ کی اونچی ہے بہت ، گردِ کفِ پا
شبیرؑ، سخاوت کا، عطاؤں کا ہے ، دریا (۲۸) شبیرؑ ہے عفّت میں، بنِ فاطمہ زہراؑ
دروازے کُشادہ ہیں ، شہِ عقدہ کُشا کے
آیاتِ خدا ، اِس کے ہی گھر، اُتری ہیں آ کے

شبیرؑ کی ہر سانس، فدا کار ہے دیں پر شبیرؑ کِنایہ بنا، تسبیحِ یقیں پر
شبیرؑ نے سجدوں کو سجایا ہے، جبیں پر (۲۹) شبیرؑ سا کوئی نہ ہُوا، فرشِ زمیں پر
سورج کی طرح روز نِکلتا ہے اُفق سے
آتی ہے سلامی اُسے، ہر شام شفق سے

شبیرؑ کی قربت رہی، جن لوگوں کو حاصل سب بن گئے وہ، مصحفِ ناطق کے حمائل
حرؔ جیسے ادھورے ہوئے، اک رات میں کامل (۳۰) ظاہر ہُوئے نصرت سے، مظاہرؔ کے فضائل
انصار بھی کیا خوب تھے، سلطانِ عرب کے
عاشق ہُوئے شبیرؑ کے اور، وحدتِ رب کے

احباب میں مشہور ، حبیبؔ ابنِ مظاہرؑ پیری میں نیا جوش ، مدد کے لیے حاضر
ہمراہ رہے جن کے بشرؔ، جابرؔ و عامرؔ (۳۱) کوفے سے فداکاروں میں، حجّاجؔ سے شاکر
قائم رہے قربانی کی ہر راہ کے اوپر
ایک ایک بہتّر تھا، فدا، شاہؑ کے اوپر

مسعودؔ فقیہہ، شوذبؔ و سلمانؔ و کنانہؔ بِن قینؔ کی قربانی رہی، شانہ بہ شانہ
بَن مالِکؔ و بِن کعبؔ کی نصرت ہے شہانہ (۳۲) اور حرِّ جری ، جس کو نہ بھولے گا زمانہ
اک شب کی بشارت سے جو صاحب نظری ہے
مولاؑ کے فداکاروں میں وہ پہلا جری ہے

چھ عُمرؔو ہیں، اور پانچ ہیں عبداللّٰہؔ مددگار جنّادہؔ ، براہیمؔ سے ، مِنہانہؔ سے انصار
بِن حارثؔ و نعمانؔ ، ادہمؔ ،سالمؔ و عمّارؔ (۳۳) قاربؔ بھی ، امرؔ ، سیفؔ بھی، ضرغامہؔ سا زوّار
اربابِ بہتّر میں، نصرؔ ، سعدؔ ہیں شامل
اِن سب کو سلامی ، سبھی نوشاد ہیں شامل

قربانی کو تیّار ہیں ، مر جائیں کہ ہوں قید   رحمانؔ و عبسؔ قاسمؔ و زرؔ ، صاحبِ جمشید
شبیرؑ کے انصار نہیں ہوتے ہیں ناپید   (۳۴)   حبّادؔہ و حنّالؔہ و مِنہالؔہ و مِن زید
یہ فتحِ حسینی ہے کہ نصرت میں رہے ہیں
قاتل کے بھی ہم نام ، محبت میں رہے ہیں

سب اہلِ وفا ، اہلِ وِغا ، اپنے ہی قد کے   سب خود میں مثالی ہیں ، شریعت کی مدد کے
سب عکس کی مانند ہیں ، اللہ و احد کے   (۳۵)   سب عابد و ساجد ہی رہے ، حیِّ صمد کے
گفتار میں اظہار میں ، اقوال میں سجدے
مرضیٔ خداوند پہ ، ہر حال میں سجدے

عاشورِ حسینیؑ ہے ، محبت کی کہانی   اِس میں ہے فقط عشق ، بڑھاپا نہ جوانی
توفیقِ تعلق میں ، نہ رنگت نہ نشانی   (۳۶)   وہ جونِؔ حبش ہو کہ بُرّیِرؔ ہمدانی
احبابِ جماعت ، بخدا سب سے الگ ہیں
شبیرؑ کے اربابِ وفا سب سے الگ ہیں

اٹھارہ تو کُنبے کے ہی ، مشہورِ زماں ہیں   ہیں چار عقیلی جو محبت میں جواں ہیں
اور چار ہی حیدرؑ کے پسر ، زمزمہ خواں ہیں   (۳۷)   عباسِؔ علیؑ قُرب میں ، اب بھی نگراں ہیں
آیا نہ کبھی ایسا ، محبت میں زمانہ
شبیرؑ کی نصرت پہ ہے ، حیرت میں زمانہ

قربانی کی فہرست میں ، مُسلمؑ کے ہیں دلدار   اک عمروؔ حسنؑ ، دوسرا قاسمؑ سا فداکار
جعفرؔ سا بھتیجا بھی ، فدا کاری کو تیار   (۳۸)   دو بھانجے ہیں، عونؔ و محمدؔ سے مددگار
اک اکبرِ ذی جاہ ، جو باباؑ پہ فدا ہے
چھ ماہ کا اصغرؔ ، صفِ نصرت میں کھڑا ہے

اِن سترّہ کنبے کے عزیزوں میں ہیں شبیرؑ   وحدت کی جماعت میں ہے اٹھارہ کی توقیر
سجادوں پہ سجدوں سے سجائی ہوئی تنویر   (۳۹)   چھوٹی سی یہ ہاشمؔ کے گھرانے کی ہے تصویر
انصار جھکائے ہوئے سر، اپنا کھڑے ہیں
گِنتی میں بہتّر ہیں، یہ فوجوں سے بڑے ہیں

کِس کِس کا بیاں ہو، سبھی باہوش رہے ہیں   عمروں کے تقاضوں سے، سُبک دوش رہے ہیں
ہر بزم میں ، ہر رزم ، میں پُر جوش رہے ہیں   (۴۰)   میدانِ شجاعت میں ، کفن پوش رہے ہیں
شبیرؑ کی نصرت کے لیے ، ارض و سما میں
یہ لوگ بھلائے نہیں جاسکتے وَغا میں

اِس مرثیۂ دل میں ، سمائے ہیں بہتّر   یکجہتیِ ، نصرت نظر آئے ہیں بہتّر
شبیرؑ نے اجماع میں دکھائے ہیں بہتّر (۴۱) مولاؑ ہیں یہاں نور ، تو سائے ہیں بہتّر
تصویرِ جماعت ہے یہی حمد و ثنا کی
اک نقطے پہ اک فکر ہے ، اربابِ وفا کی

اِن سب کے فضائل میں بھلا کون ہے چیدہ   کِس کے ہیں محبّوں میں الگ، وصفِ حمیدہ
سب ایک زباں ہوکے پکارے یہ، بہ دیدہ (۴۲) ہم سب کا تبسم ، علی اصغرؑ کا قصیدہ
ہنستا ہُوا ، گہوارۂ نصرت میں کھڑا ہے
یہ ننھا مجاہد ہے ، جو ہم سب سے بڑا ہے

اصغرؑ کی صغیروں میں بہت دھوم رہی ہے   جو ذات نسب میں ہے وہ مخدوم رہی ہے
ہر اک کی صفت ، فخر سے موسوم رہی ہے (۴۳) معصوم کی ہر نسل ہی معصوم رہی ہے
جو جو بھی ہے وہ عقدہ کشا ، فیض رساں ہے
اِس کا بھی علیؑ نام ہے یہ بابِ اماں ہے

گہوارے کا ساکن، شہِ ذی جاہ ہے اصغرؑ   بچپن سے شہادت کا بہی خواہ ہے اصغرؑ
بے ساختہ نکلی ہوئی اک آہ ہے اصغرؑ (۴۴) پیاسا تو یقینا ہے مگر چاہ ہے اصغرؑ
ہنس دے تو کرے زیر و زبر فوج کو رن کو
جھولے ہی میں یہ چیر دے، اژدر کے دہن کو

اک برق کی مانند ہے فانوس ہے اصغرؑ   نصرت کے چمن زار میں طاؤس ہے اصغرؑ
احساس میں انفاس میں ملبوس ہے اصغرؑ (۴۵) ششماہا ہے، پر رزم سے مانوس ہے اصغرؑ
البیلا ہے بے شِیر ، ہر اک اہلِ وِغا سے
انداز نئے لایا ہے ، درگاہِ خدا سے

بیداریٔ نصرت سے ہے آگاہ بھی اصغرؑ   ذی قدر بھی معصوم بھی ذی جاہ بھی اصغرؑ
یعقوبِ شہادت کا طلب خواہ بھی اصغرؑ (۴۶) انصار میں یوسفؑ بھی ہے اور چاہ بھی اصغرؑ
اپنی ہی بنائی ہوئی تدبیر سے آگے
سبقت میں کوئی بھی نہیں بے شِیر سے آگے

سب نے اسے دیکھا ہے بس آغوشِ پدر میں   ششماہا ہے بے شیر ہے یہ سب کی نظر میں
شبیرؑ کا شہباز ہے ، پرواز میں پر میں (۴۷) رفتارِ تصور سے بھی آگے ہے ظفر میں
خورشید سے بالا ہے بلندی پہ اگر جائے
سوچے کوئی اس کو تو یہ سینوں میں اُتر جائے

(۴۸)
الفاظ و معانی میں جو یکتا ہے تو یہ ہے
جاں بازوں کی منزل کا جو رستا ہے تو یہ ہے
اشکوں کی روانی میں چمکتا ہے تو یہ ہے
خاموش زبانی میں جو برپا ہے تو یہ ہے
شبیرؑ کے مقصد کے اصولوں میں ہے اصغرؑ
کلیوں میں ہے، غنچوں میں ہے، پھولوں میں ہے اصغر

(۴۹)
خورشید ہے، امید ہے، مہتاب یہی ہے
شعلہ ہے، شرر بار ہے، سیماب یہی ہے
اک فرض ادا کرنے کو بیتاب یہی ہے
جب سے ہے سفر شاہؑ کا، خواب یہی ہے
شبیرؑ لگا لیتے ہیں ، سینے سے تھپک کے
قربانی کے کرتا ہے اشارے یہ ہُمک کے

(۵۰)
چھوٹا سا ستارہ ، مہِ انور کے برابر
نصرت میں درخشندہ ہے ، حیدرؑ کے برابر
کوئی بھی نہیں ہے، علی اصغرؑ کے برابر
ننھا سا مجاہد ہے یہ ، لشکر کے برابر
ظالم کے دل و ذہن پہ چھایا ہوا ڈر سا
معصوم تبسم بھی ہے تیغوں کے اثر سا

(۵۱)
اِس بچّے نے لہجہ دیا ، گویائی کے فن کو
اصغرؑ پہ بڑا ناز ہے، مختارِ زمن کو
خوشبوؤں نے چوما ہے بہت غنچہ دہن کو
سر سبز رکھا ہنس کے شہادت کے چمن کو
نازاں علی اصغرؑ پہ زمیں بھی ہے، فلک بھی
پابوسی کو گہوارے تک آئے ہیں ملک بھی

(۵۲)
سمجھو تو، یہ داناؤں میں ذی شان ہے اصغرؑ
دیکھو تو، یہ ششماہا ہے ، نادان ہے اصغرؑ
جانو تو، چراغِ تہہِ دامان ہے اصغر
پرکھو تو، شہادت کا نگہبان ہے اصغرؑ
ہر بات نرالی رہی، ہر ایک محل پر
قرآں یہ بنا شاہؑ کے ہاتھوں کی رِحل پر

(۵۳)
اپنا لبِ اعجاز دکھانے کی تمنا
اصغرؑ کو بھی میدان میں ہے آنے کی تمنا
شمشیرِ تبسم کو اُٹھانے کی تمنا
طفلی کو جوانی میں جگانے کی تمنا
خاموش صداؤں کے یہ مابین بہت ہے
مُٹھّی کو دبائے ہوئے، بے چین بہت ہے

(۵۴)
پھر خود کے توازن سے سنبھل ہے اصغرؑ
گہوارے کی رسّی سے پھسل جاتا ہے اصغرؑ
ماں گود میں لیتی ہے مچل جاتا ہے اصغر
گھٹنوں کے سہارے کبھی چل ہے اصغر
پھولی ہوئی سانسوں میں نہاں، کرب و بلا ہے
معصوم مجاہد میں عجب، جوشِ وغا ہے

تا حدِّ نظر ، ماہِ محرّم ہے نظر میں　اک ہُو کا سا عالم ہے جو ہر دم ہے نظر میں
کہرام ہے اور گریہ و ماتم ہے نظر میں　(۵۵)　عاشور حسینؑ کا ہر اک غم ہے ہے نظر میں
لاشوں کو اکیلے ہی اُٹھا لائے ہیں بابا
خیمے سے گئے ہیں، کبھی پھر آئے ہیں بابا

اصغرؑ کی نگاہوں میں ہیں شبیرؑ کے پیارے　اوجھل ہوئے آنکھوں سے سبھی چاند ستارے
اک روز میں خاموش ہوئے سارے سہارے　(۵۶)　عباسؑ بھی رخصت ہوئے، اکبرؑ بھی سِدھارے
خالی ہے حرم، قاسمِؑ امجد بھی نہیں ہے
نصرت کے لیے عونؑ و محمدؑ بھی نہیں ہے

اب کوئی نہیں بیکس و مضطر کا مددگار　مرنے کے لیے رن کو چلے سیدِ ابرار
دیکھا جو یہ اصغرؑ نے تو چلائے کئی بار　(۵۷)　آخر یہ ہُوا کُھل گئے گھوارے کے پندار
چلائیں یہ بانوؑ کہ ادھر آیئے مولاؑ
مقتل کی طرف رُک کے ذرا جایئے مولا

یہ دیکھیے کس درجہ پریشان ہے اصغرؑ　ٹھہراتا ہے نظروں کو ہر اک چہرے کے اوپر
سب بعدِ شہادت کے بھی آنکھوں میں ہیں منظر　(۵۸)　مٹھی سے پکڑ لیتا ہے، زینبؑ کی یہ چادر
چھایا ہُوا اک غم ہے، کلیجے پہ اثر ہے
بس بالی سکینہؑ کی طرف اس کی نظر ہے

خیموں میں جو لاشوں کی ہے صف، دیکھ رہا ہے　کب اِس کو مِلے اذِن و شرف دیکھ رہا ہے
سنّاٹوں کے جو ہوں کے ہدف دیکھ رہا ہے　(۵۹)　عابدؑ کے یہ قدموں کی طرف دیکھ رہا ہے
چھولیں ذرا مولاؑ اسے، مغموم بہت ہے
پیاس بھی ہے، تنہا بھی ہے، مظلوم بہت ہے

یہ سُن کے اسے شاہؑ نے سینے سے لگایا　فرمایا کہ اب جانے دو مرنے ہمیں بیٹا
یہ سنتے ہی اصغرؑ نے کیا اپنا اشارا　(۶۰)　کیا کہہ دیا چُپ ہوگئے خود سیّدِ والا
پھر ہو کے مخاطب یہ کہا اہلِ حرم سے
بے شیر نے باندھا ہے ہمیں حق کی قسم سے

لڑنے کے لیے جائیں گے یہ ساتھ ہمارے　طفلی میں ہی اندازِ وغا سیکھے ہیں سارے
ہیں نصرتِ حق کے لئے سب ہم سے اشارے　(۶۱)　دکھلائیں گے یہ پیاس کو دریا کے کنارے
پیاسے کی بھی اک مُہر ضروری ہے زباں پر
اصغرؑ کا بھی حق چاہیے جنت کے مکاں پر

سب اہلِ حرم آؤ ، اب اصغرؑ کو سجاؤ اے بانوئے مضطر ذرا زینبؑ کو بُلاؤ
ہے وقتِ جدائی انھیں گودوں میں اٹھاؤ (۶۲) ننھے سے مجاہد کو کلیجے سے لگاؤ
جاتا ہے یہ مرنے کو ، قیامت کی گھڑی ہے
اصغرؑ کی جدائی ہے اجل سر پہ کھڑی ہے

پھر گود میں اصغرؑ کو لیے غم میں گرفتار پہنچے سرِ میدانِ شہادت، شہِ ابرار
نرغے کی طرف دیکھ کے چومے لب و رخسار (۶۳) بے شیرِ مجاہد کی ہوئی آخری گفتار
جنگاہ میں کیا فائدہ اظہار و طلب سے
ہنستے ہوئے اصغرؑ نے نظر پھیر لی سب سے

کیا کہیے کہ جو بھی ہے یہاں ، وہم و گماں کا اس ظلم کے لشکر میں نہیں کوئی اماں کا
ایماں سے تعلق ہے نہ غم تشنہ دہاں کا (۶۴) دشمن میں کوئی بھی نہیں، معیارِ زباں کا
قاتل ہیں یہ حق دار دعا کے بھی نہیں ہیں
سب اہلِ شقاوت ہیں، خدا کے بھی نہیں ہیں

تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں مجاہد کی یہ تقریر یک لخت بنِ کاہلِ بد خواہ کا اک تیر
جنگاہ سے، رفتار سے آیا سوئے شبیرؑ (۶۵) کیا کہیے کہ بس خون اُگلنے لگا بیشیر
منھ موڑ کے مقتل میں بہت روئے عدوُ تک
سرخیٔ لہو بازو سے خشکیدہ گُلوُ تک

اک ہاتھ سے اصغرؑ کو سنبھالے شہِؑ خوش خو وہ نرغۂ اعدا سے مِلے درد کے پہلو
تر خون سے مولا کے ہوئے سینہ و بازو (۶۶) تاریکیٔ شب دن میں نظر آتی تھی ہر سو
گلشن ہوا ویران، گلِ تر بھی سِدھارے
تنہا ہوئے مولاؑ، علی اصغرؑ بھی سدھارے

لاشہ علی اصغرؑ کا لیے سیّدِ عالاؑ داخل ہوئے خیمے میں تو زینبؑ نے سنبھالا
ماں روکے پکاری کہ مرا ہنسلیوں والا (۶۷) رخصت ہُوا ہے ہے مری آنکھوں کا اجالا
ہے کیسا اندھیرا کہ سُجھائی نہیں دیتا
اصغرؑ جو نہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا

اے بیبیو اٹھو ، مرے بچّے کو اٹھاؤ ہے خوں میں نہایا ہوا ، چہرہ تو دکھاؤ
پیاسا ہے بہت ، آنکھوں کے آنسو ہی پلاؤ (۶۸) ہے نیند یہ کیسی، مرے اصغرؑ کو جگاؤ
کہہ دو کہ سرہانے شہِؑ دلگیر کھڑے ہیں
ہاتھ اپنا دبائے ہوئے شبیرؑ کھڑے ہیں

ہر سمت تھا خیمے میں عجب گریہ و ماتم ۔۔۔ نا قابلِ برداشت ہُوا جاتا تھا یہ غم
مولا نے بڑے صبر سے لاشے پہ کیا دم ۔۔۔ (۶۹) تربت کے لیے خیمے سے نکلے شہِؑ عالم
ننھی سی لحد کھودی اکیلے ہی جری نے
دی فاتحِ خیبر کو صدا ابنِ علیؑ نے

اے عقدہ کشاؑ میری مدد کے لیے آئیں ۔۔۔ ہر اہلِ کِساؑ کو یہ مناظر بھی دکھائیں
یہ آخری فِدیہ تھا مِرا، سب کو بتائیں ۔۔۔ (۷۰) ماتم ہو شہیدوں کا جہاں ، آپ بھی جائیں
ہر شُکر بصد ناز و نعم سونپ رہا ہوں
ان آپ کے ہاتھوں میں علَم سونپ رہا ہوں

شبیرؑ نے سب وعدۂ طفلی ہیں نبھائے ۔۔۔ جو جو بھی ہیں وحدت کے مقاصد ، وہ بتائے
ہونٹوں پہ کبھی حرفِ شکایت نہیں آئے ۔۔۔ (۷۱) تھی جتنی سکت غم کو اُٹھانے کی آٹھائے
سر نذرِ خدا ہے یہ شرف دیکھ رہا ہوں
اب آخری سجدے کی طرف دیکھ رہا ہوں

ناشرؔ ہیں، ہر اک آنکھ میں آئے ہوئے آنسو ۔۔۔ ماتم کے بیاں میں ہیں سمائے ہوئے آنسو
اِس مرثیۂ غم پہ ہیں چھائے ہوئے آنسو ۔۔۔ (۷۲) اصغرؑ کے تبسم میں ، نہائے ہوئے آنسو
تحفہ ہیں یہ فرزندِ امامِ ازلی کا
یہ آنسو ہی پُرسہ ہیں حسینؑ ابنِ علیؑ کا

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد ۴)
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

کراچی کی عزاداری
ڈاکٹر عقیل عباس جعفری
(شائع ہوگئی ہے)

سلام

احمر شہوارؔ

دمِ شہادت یہ کون نبضِ حیات تھامے کھڑا ہوا ہے
وہ جس کے صبر و یقیں کا آہن رضائے رب میں ڈھلا ہوا ہے

وفا کی کرنیں نمود پا کر خود اپنے خورشید اجالتی ہیں
عجب قیامت کی روشنی ہے چراغ لیکن بجھا ہوا ہے

فراقِ بابا میں مرتجز کے سموں سے لپٹی ہے یاس کوئی
جبھی تو راکب بڑھائے لیکن مطیع مرکب رکا ہوا ہے

میانِ مقتل زمیں پہ تازہ گلِ شہادت کھلے ہوئے ہیں
وہ جن کی خوشبو سے دشتِ خونیں نظیرِ جنت بنا ہوا ہے

شفق کی سرخی رخِ حسیں پر مثالِ کندن پگھل رہی ہے
کسی کا معصوم خونِ ناحق خضابِ وصلِ خدا ہوا ہے

یہ کس نے پہنا ہے چاندنی کا لبادہ مقتل سے قبل تن پر
شبابِ عصرِ دہم پہ قوسِ قزح سے سارا رنگا ہوا ہے

یہ کس کے ہاتھوں میں بجلیوں کی رُپہلی کوندیں تڑپ رہی ہیں
یہ کس نے فوجِ ستم کو تیغِ بلا کی زد پہ رکھا ہوا ہے

وہ میمنہ ہو کہ میسرہ ہو یا قلبِ لشکر حدِ نظر تک
تڑپتی روحوں فگار لاشوں سے سارا صحرا پٹا ہوا ہے

وہ ارجعی کی صدا لگا کر تری رضا میں رضا ملا کر
مقامِ ذبحِ عظیم پر خود فلک سے جلوہ نما ہوا ہے

لگام چھوڑے، حسام رکھ کر، صدا پہ لبیک کہہ رہا ہے
یہی تو ہے نفسِ مطمئنہ رضائے رب میں جھکا ہوا ہے

شکن جبیں پر نہ لب پہ شکوہ اٹھا کے لاشے پہ لاشہ تنہا
کسے خبر ہے کہ میرا مولا حسینؑ کتنا تھکا ہوا ہے

یہ آندھیاں، یہ لہو کی بارش، یہ زلزلہ، یہ فشارِ دریا
معال ہے جس کا سر بلندی بدن سے وہ سر جدا ہوا ہے

فلک سے شہوارؔ عصرِ عاشور کربلا میں صدا یہ گونجی
کبھی نہ ایسی اذاں سنی تھی نہ ایسا سجدہ ادا ہوا ہے

❀❀❀❀

علامہ طالب جوہری ورثائی تنقید۔۔۔ایک مختصر مطالعہ

فرحان رضا

علامہ طالب جوہری ایک مجمع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت مستند عالم دین، بلند پایہ خطیب، مورخ، مقتل نگار، منطق و فلسفہ کے ماھر، شاعر، مرثیہ نگار وادیب تھے۔اوپر لکھی گئی تمام اصناف و جہات پر انکی تصانیف موجود ہیں۔علامہ طالب جوہری قبلہ نے درجنوں کتابوں پر تقاریظ وتبصرے تحریر فرمائے جوکہ تقریظ وتنقید کے انتہائی اعلیٰ نمونے قرار دئے جاسکتے ہیں۔اس مضمون میں صرف انکے رثائی مضامین کا مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ تمام مقالے راقم کی مرتب کردہ کتاب ''رثائیاتِ علامہ طالب جوہری'' میں شامل ہیں۔ایک عالمِ دین جوکہ عربی وفارسی کا ماھر ہوساتھ ہی ساتھ خود مرثیہ گوشاعر بھی ہوتو اسے ہی زیب دیتا ہے کہ اپنے عہد کے ہر اہم ونامور مرثیہ گوشاعر پر خامہ فرسائی کرے اور وہ شاعر کڑی سے کڑی تنقید کو بھی اپنے لیے سند کا درجہ سمجھ کر اپنی کتاب میں بصد افتخار شامل کرلے۔علامہ صاحب کے لکھے گئے دیباچے وتقاریظ کے حوالے سے راغبؔ مرادآبادی اپنی ایک رباعی میں اس طرح لکھتے ہیں

ہے موت کا آپ اپنی نظر میں ہر طور
ہیں جوہری پرکھا ہے یہ ہیرا فی الفور
تقریظِ علامہِ طالب پڑھیئے
اہلِ ادب و علم و ہنر آپ بغور

افتخار عارف صاحب بھی علامہ طالب جوہری کے ان مضامین کے حوالے سے لکھتے ہیں" ہمارے عہد کے نامور سخنوروں کی تخلیقی، رثائی و ادبی خدمات کے حوالے سے سپردِ قلم کیے جانے والے یہ مضامین ایک بہت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، ان پر نظر ڈالنے سے آپ کو پاکستان کی تہذیبِ عزاداری اور اردو مرثیہ کے مختلف ادوار کے رجحانات کو سمجھنے و پرکھنے میں آسانی ہوگی"۔علامہ طالب جوہری کا یہ تنقیدی سفر سن ۵۷ کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور انتقال سے کچھ سال قبل (تقریبا ۲۰۱۸ء) تک جاری رہتا ہے۔اس دوران علامہ طالب جوہری نے اس عہد کے تقریباً تمام نمایاں مرثیہ نگاروں اور رثائی کتابوں پر لکھا ہے۔علامہ جمیلؔ مظہری، صباؔ اکبرآبادی، شادانؔ دہلوی، امیدؔ فاضلی، راغبؔ مرادآبادی، فیضؔ بھرتپوری، شاہدؔ نقوی، مولانا حسنؔ امداد، مشکور حسین یادؔ، سردار نقوی، قسیمؔ امروہوی، ثاقبؔ مظفرپوری، ڈاکٹر ہلالؔ نقوی، کوثر نقوی، شہرتؔ بلگرامی، سرفراز ابدؔ۔اس کے علاوہ بھی بہت سے مرثیہ گوشاعروں کے کلام پر علامہ کی تحریر موجود ہے جس سے انکا تنقیدی اسلوب نمایاں ہے۔ڈاکٹر محمد رضا کاظمی اپنی کتاب ''جدید اردو مرثیہ، جلد دوم صفحہ نمبر ۳۳۹'' پر لکھتے ہیں۔''ایک انتہائی اثر ونفوز رکھنے والے ناقد علامہ طالب جوہری ہیں جن کے دیباچے اور مقدمے خاص الخاص اہمیت رکھتے ہیں''۔علامہ طالب جوہری نے ان مضامین میں صرف شاعروں کو مدنظر رکھ کر گفتگو نہیں فرمائی ہے بلکہ بہت سے دیگر موضوعات پر شاعری کے تناظر میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جسمیں

فلسفہ ومنطق، خطابت، فنِ مرثیہ گوئی، علم العروض، علومِ معاشرت، شاعر کے لئے شرائط (سورہ شعرا کی روشنی میں)۔غرض بھرپور مقالے تصنیف ہیں۔علامہ طالب جوہری کا تنقیدی شعور بہت بلند تھا اور ظاہر ہے کہ ان خیالات کے اظہار کے لیے انکے پاس نادرونایاب الفاظ و منفرد لب ولہجہ تو موجود ہی تھا۔علامہ صاحب صرف لگے بندھے تعریفی وتوصیفی کلمات نہیں لکھتے تھے بلکہ بانگ دہل اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔کچھ آرا پیشِ خدمت ہیں، یاد رہے کہ ان مضامین میں تعریف وتوصیف کے بعد یا اس کے ساتھ علامہ صاحب نے یہ آرا تحریر فرمائی ہیں۔شاہدؔ نقوی پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں شاہدؔ نقوی کا تعلق ان دونسلوں سے ہے جن میں سے ایک آزاد ہونے کے لئے سربکف تھی اور دوسری آزاد رہنے کے لیے کوشاں ''پھر آگے چل کر لکھتے ہیں'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طنز نگاری شاہدؔ نقوی کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے اور یہ طنز نگاری انکی مرثیہ گوئی کے پورے عہد پر محیط ہے''۔فیض بھرت پوری کے مرثیوں پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں ''فیضؔ صاحب کی زبان رواں ہے اور خطابت مطلق نہیں ہے''۔صباؔ اکبرآبادی کے مرثیے پر کہتے ہیں'' جدید شاعری کا جو مزاج بنتا جارہا ہے اس میں ہر چند بعض گوشوں میں فکری شاعری کو ترقی نصیب ہوئی ہے لیکن روایتی شاعری میں جو مذہبی اور اخلاقی مضامین حمد ونعت کے ملتے ہیں ان پر اعلیٰ فکری سطح پر رہ کر شعر گوئی کا۔حوصلہ عام نہیں ہے۔مشکور حسین یادؔ کے سلاموں پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں'' مشکور حسین یادؔ اگر اپنے سلاموں کو سلاموں کے نام سے یاد نہ بھی کرتے تو انکے لیے کوئی نئی اصطلاح وضع کرنی پڑتی، اس لیے کہ بہت سے ایسے سلام ہیں جو رثا وعزا سے یکسر خالی ہیں''۔مولانا حسنؔ امداد کی کتاب پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں'' میرے لیے ناگزیر ہے کہ میں اس مرحلے پر اپنے ان اختلافات کا ذکر کروں جنکے بغیر میری بات مکمل نہیں ہوسکتی ہے'' ان اختلافات کے اظہار کے بعد خود ہی توجیہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں'' اسکا سبب یہ ہو کہ مولانا نے اپنے مضمون اور خیال کو اپنی شاعری پر قربان کرنا چاہا ہے''۔سردارؔ نقوی پر لکھتے ہوئے ایک مقام پر کہتے ہیں'' ساقی نامہ عام سطح کا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صرف خانہ پری کے لیے نظم کیا گیا ہے'' ساحرؔ فیض آبادی پر لکھتے ہوئے کچھ عروضی نقائص پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اسے ساحرؔ صاحب کا ترکِ اولیٰ کہ کر بات کو معتدل کردیا۔شاداںؔ دہلوی پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں'' شاداںؔ کے مرثیوں میں لہجے کی تلخی زیادہ ہے، میں اسکی تمام ادبی کاٹ اور شعری تیکھاپن کے اعتراف کے باوجود کبھی اس طریقہ اظہار سے متفق نہیں ہوسکا''۔علامہ کی تقاریظ سیدھی سادھی فارمولا تحریر نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ بہت عمیق نظر سے کلام کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے مخصوص انداز سے دقیق رائے پیش کرتے تھے۔ان مضامین میں منفرد اسلوب، ندرتِ فکر اور انشاپردازی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے جس سے یہ مضامین ومقالے ادبِ عالیہ بالخصوص تنقیدی ادب میں اعلیٰ اضافے قرار دئے جا سکتے ہیں۔کچھ مثالوں کے بعد اس گفتگو کا اختتام کرتے ہیں۔علامہ طالب جوہری اعلی اللہ مقامہ کے رثائی مضامین سے مرثیے وسلام پر چند انتہائی اہم اقتباسات: نوٹ: یہ تمام اقتباسات راقم کی تحقیق وتدوین ''رثائیاتِ علامہ طالب جوہری'' سے اخذ کئے گئے ہیں۔ایک یادگار تصویر بھی پوسٹ کی ہے جس میں خاکسار حضرتِ علامہ کو اسی کتاب کا مسودہ پیش کررہا ہے۔تصویر جنوری ۲۰۲۰ء کی ہے۔''سورہ شعرا کی آخری آیت کی روشنی میں شاعر کے لیے چار شرائط کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ایمان، عملِ صالح، بکثرت ذکرِ خدا اور نصرتِ مظلوم۔اردو ادب کے تمام اصناف میں مرثیہ وہ واحد صنف ہے جو ان شرائط کو بیک وقت پورا کرتا ہے اور اس سے بڑھ کر اس صنف کی جلالت اور افادیت کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے'' مذہب اپنے مزاج میں صد حیرت رکھتا ہے۔ادب کا بھی اپنا ایک مزاج ہے۔اسمیں وفا ہے، یہ دونوں جذبے ایک دریا کے دو

کناروں کی مانند ایک دوسرے کے مقابلے چلتے رہتے ہیں اور کسی جگہ ملتے نہیں۔مگر جس سرزمین پر یہ دونوں جذبے آپس میں معانقہ کرتے ہیں، جہاں یہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں، اس زمین کا نام مرثیہ ہے‘‘۔’’مرثیہ نگاری نام ہی قدرتِ کلام کا ہے، جو قادرالکلام نہ ہو اس کے لیے مرثیہ نگاری کا کوئی جواز نہیں‘‘’’قدیم مرثیہ نگاروں نے ہرممکن کوشش کی کہ مرثیہ ادبی صنف رہے خالص مذہبی نظم بن کر نہ رہ جائے ورنہ میر انیسؔ کو کیا ضرورت تھی کہ ایک پھول کا مضمون سو رنگ سے باندھنے کی کوشش فرمائیں، یہی سبب ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کو جہاں بھی موقع ملتا ہے وہاں زمینِ مرثیہ پر شعریت کے پھولوں کی تخم ریزی کرتے ہیں‘‘’’وہ شاعری جو خود کلامی نہ ہو بلکہ ایک پیغام ہو اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ترسیلِ مفہوم کا مسئلہ ہے اگر قاری یا سامع تک پیغام نہ پہنچ سکے تو شاعری کی مقصدیت مجروح ہو جاتی ہے‘‘’’سلام کے عناصرِ اربعہ نعت،منقبت،نوحہ وغزل کے مضامین عالیہ پر مشتمل ہیں،غزل کے مضامینِ عالیہ سے مراد ہے کہ جن دقیق،عمیق،فلسفیانہ،صوفیانہ تہذیبی ونفسیاتی مضامین کے بوجھ سے غزل کی کمر لچک جاتی ہے انھیں باآسانی سلام کے مضبوط کاندھوں پر بار کیا جاسکتا ہے‘‘۔آخری اقتباس معروف سوزخواں آباد محمد زائر نقوی پر لکھے ہوئے مضمون سے ہے جہاں علامہ کے اسلوب پر جتنی داد دی جائے کم ہے۔’’میں کم و بیش تیس سال سے انکی سوزخوانی سے مستفید ہوتا رہا ہوں،ایک مخصوص ترنم کی فضا میں لہجہ کا ٹھہراؤ،لفظوں کی ادائیگی میں نہ غیر ضروری زیر نہ نامناسب بم۔

سلام

ساجدؔ علی

خاکِ دل گر کربلا کی خاک پر واری نہ ہو ۔۔۔ کچھ خبرداری عزاداری وفاداری نہ ہو
خون کو جمنے نہیں دیتی ہے ہے ماتم کی تپش ۔۔۔ منجمد ہو جائے ہستی گر یہ چنگاری نہ ہو
دستِ ماتم سے وہ کیا لکھّے گا دل پر یا حسینؑ ۔۔۔ جب عزا خانہ ہی دل کی چار دیواری نہ ہو
عشق کی پہلی علامت اشک افشانی ہے دوست ۔۔۔ عشق تو اس دل میں ہے گو درد سے عاری نہ ہو
مس نہ ہونے دیں ریاکاری عزاداری کے ساتھ ۔۔۔ مول کیا اس مال کا جس کی خریداری نہ ہو
درس فنکاروں کو یہ دیتا ہے فنِّ شاعری ۔۔۔ وہ سُخن الہام ہے جس میں یہ فنکاری نہ ہو
تخمِ تقویٰ بو کے دل میں اشک سے سینچا کیے ۔۔۔ بو ترابی ہیں تو کیوں ساجدؔ زمینداری نہ ہو

غیر مطبوعہ مرثیہ حق

علی عرفانؔ

حق کے کرم سے حق کی ثنا میں اٹھا قلم اِس بحر بے کراں کو بلونے لگا قلم
اظہارِ حق کی راہ پہ جب بھی چلا قلم (۱) میدانِ زندگی میں علم بن گیا قلم
نقطے نے دی زباں تو قلم بولنے لگا
مفہومِ حق کی پھر وہ گرہ کھولنے لگا

حق ثابت وہ ثبوت بھی ہے اور ثبات بھی اسمِ صفات بھی ہے یہی اسمِ ذات بھی
اس ایک لفظ میں ہے نہاں ممکنات بھی (۲) حق ایک نامِ خالقِ کُل کائنات بھی
فرہنگ اور لغت کی کہانی نہ پوچھیے
کتنے ہیں لفظِ حق کے معانی نہ پوچھیے

ہے مِلک کوئی شئے تو ہے اُس شئے پہ اپنا حق سچ بات پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کہنا حق
ہے نام حسن و عدل کا خیر و صفا کا حق (۳) جس جا برائی ہو نہ وہاں پایئے گا حق
جو حق کے ساتھ ساتھ ہو انسان ہے وہی
حق کے خلاف جائے جو بطلان ہے وہی

قرآن حق ہے قولِ رسالتؐ کے ساتھ ساتھ توحید رب کی حق ہے عدالت کے ساتھ ساتھ
حق ہیں نبوتیں بھی امامت کے ساتھ ساتھ (۴) رجعت بھی حق ہے یومِ قیامت کے ساتھ ساتھ
حق ہے کمالِ حسن بھی حسنِ کمال بھی
حق رب کا ہے جمال بھی جاہ و جلال بھی

ڈھونڈا کتابِ حق میں جو حق کو، نظر مری اعراف، سجدہ، ص، رمز، ق پر گئی
یسٓ و صافات میں تھی حق کی روشنی (۵) احقاف و حج و اسرا قصص فصلّت میں بھی
قربان خدائے پاک کے اِس اہتمام پر
قرآن میں حق کا لفظ ہے بارہ مقام پر

اِن آیتوں میں ذکرِ ضلالت شعار ہے جھوٹوں کا تذکرہ ہے کہ حق جن پہ بار ہے
اُن کا ہے ذکر جن کے مقدر میں نار ہے (۶) یعنی تبرّا سُنّتِ پروردگار ہے
قہر و جلال و غیض و غضب اور عقاب حق
بارہ کے دشمنوں پہ خدا کا عذاب حق

اب دیکھیں حق کے باب میں کہتے ہیں کیا علیؑ علمِ نبی کے شہر کے بابِ عطا علیؑ
مظہر خدائے پاک کے صلِّ علیٰ علیؑ (۷) نکتہ ملا یہ آپ کے خطبوں سے یاعلیؑ

حق تک اگر ہے آتا تو پہچان چاہیے
پہچاننا ہے حق کو تو عرفاں چاہیے

ملتا ہے حق کی راہ میں ذکرِ رسولؐ بھی کرتا ہے حق کے ساتھ ہی اعلانِ حق نبیؐ
مبعوثِ کردگار ہوئے حق کے ساتھ ہی (۸) حفظانِ حق بھی جبکہ تھا کارِ پیمبری

مخلوط کرنے حق کو جو باطل تھا گھات میں
احمد نے دی حق کی باگ دی عترت کے ہاتھ میں

حق کی ہے یہ صفت کہ پہنچتا ہے اہل تک حیدرؑ نے حق کے باب میں بالکل کیا نہ شک
دوراہے پر ہے جو حق و باطل کے آج تک (۹) حق جو اگر ہے ساتھ علیؑ کے ہو بے دھڑک

حیدرؑ سخی کریم ہیں مشکل کشا بھی ہیں
حیدر ہیں خود صراط بھی خود رہنما بھی ہیں

باطل سے حق کی ہوتی ہے جنگ و جدال جب حیدرؑ کی تیغ بنتے ہیں اصحابِ حق طلب
حیدرؑ کا غضب حق ہوا بحرِ شہِؑ عرب (۱۰) حیدرؑ خموش تھے کہ یہی تھی رضائے رب

حق کا ثبات شر کے پرستار جان لیں
باطل کی جیت اصل میں ہے ہار جان لیں

باطل کا خاتمہ ہے جو ہو حق پہ اتحاد حق سے ہٹو گے ترک اگر کی رہِ جہاد
نقصا ہے جو حق سے نہ حاصل کرو مفاد (۱۱) بے جہد راہِ حق میں نہ ہاتھ آئے گی مراد

حیدرؑ کی طرح خار سے خوشبو نکال لو
باطل سے حق کو چیر کے پہلو نکال لو

یہ قول حق کے ساتھ عمل حق کے ساتھ ہو ہو زیست حق کے ساتھ اجل حق کے ساتھ ہو
ہے آج حق کے ساتھ تو کل حق کے ساتھ ہو (۱۲) ہر ایک اپنی زیست کا پل حق کے ساتھ ہو

وہ بارگاہِ قدس میں افضل ترین ہے
حق پر عمل کا شوق جسے بالیقین ہے

اسوادِ حق میں ایک ہے تقلیدِ خواہشات سو دوسری بڑی ہے فراموشیِ ممات
افراد جن میں ہوتی ہیں ایسی ہی سب صفات (۱۳) رہتے ہیں دور حق سے وہی لوگ تاحیات

لوگ ایسے گر کسی کے مقابل ملیں تو صاف
گر حق کو ڈھونڈو ، پاؤ گے در حزبِ اختلاف

کہتے ہیں شک کو شک کہ وہ لگتا ہے حق سمان	ہوتا ہے گویا رات پہ دن کا کبھی گمان
اہلِ ولا ہی رکھتے ہیں پھر حق کی آن بان	لے کر سپر یقین کی کرکے علیؑ کا دھیان
لیکن جو شک کے پھیر میں کچھ لوگ اٹک گئے
حق جان کر گماں کو خوارج تھک گئے (۱۴)

تلقین میں بھی حق کا ہمیں تذکرہ ملا	حق وہ ہے جو کہ آیا تھا ہمراہِ مصطفیٰؐ
حق موت بھی ہے حق ہے سوالِ ملائکہ	میزان حق ہے جنت و دوزخ بھی حق سرا
حق ہے لحد سے اٹھنا بھی یوم حساب بھی
حق ہے صراط ، حق ہے عمل کی کتاب بھی (۱۵)

حق بحرِ بے کراں ہے یہ معلوم ہوگیا	حق رمزِ کُن فکاں ہے یہ معلوم ہوگیا
حق جانِ دو جہاں ہے یہ معلوم ہوگیا	حق کس قدر گراں ہے یہ معلوم ہوگیا
مہمیزِ فکر اب یہ اچھوتا اصول ہے
حق ہے علیؑ کے پیچھے دعائے رسولؐ ہے (۱۶)

تا حشر یہ اصول پیمبرؐ نے دے دیا	پیچھے علیؑ کے جو نہ ہو وہ حق نہیں رہا
ہر دور کا علیؑ ہے سدا حق کا رہنما	لو جارہا ہے ایک علیؑ سوئے کربلا
شبیرؑ کربلا چلے حیدرؑ کے روپ میں
اور حق سمٹ کے آگیا اصغرؑ کے روپ میں (۱۷)

اصغرؑ بنا تھا باپ کا سایہ اسی لیے	بچے کو کربلا نے بلایا اسی لیے
صغرؑا کی گود چھوڑ کے آیا اسی لیے	جھولے سے اُس نے خود کو گرایا اسی لیے
پیچھے علیؑ کے حق کا یہ محور بھی جائے گا
جائیں جدھر حسینؑ یہ اصغرؑ بھی جائے گا (۱۸)

تاریخ میں لکھا ہے کہ در دشتِ نینوا	افراد دو تھے جو کہ تھے ہم شکلِ مرتضیٰؑ
عباسؑ ایک یعنی علمدارِ کربلا	اور دوسرا ربابؑ کی آغوش کا پلا
پرتو تھے دونوں شاہِؑ نجف کے جمال کے
یہ چھ مہینے والے وہ بتیس سال کے (۱۹)

یکسانیت کے دونوں میں پہلو کئی ملے	دونوں ہی آخری تھے سپاہی حسینؑ کے
دونوں ہیں آج بابِ حوائج بنے ہوئے	اک وقت آیا دونوں سنبھل جب نہیں سکے
ششماہا گاہوارے پہ عباسؑ زین پر
آئے تھے سر کے بل یہ سپاہی زمین پر (۲۰)

اصغرؑ کو اپنی گود میں لے کر شہِؑ ہوا آئے قریں ربابؑ کے اور روکے یہ کہا
کرتے ہیں سعیٔ آب کہ پیاسا ہے یہ مہ لقا (۲۱) ماں نے کہا کہ تم بھی چلے میرے دلربا
ہاں کیوں نہ ہو کہ فاتحِ خیبر کے لال ہو
کیونکر نہ تم کو حق کی بقا کا خیال ہو

ارمان بہت تھے کوئی نہ حسرت نکل سکی ماں کہہ کے تم پکارو یہ خواہش بھی رہ گئی
تھا چار دن کا ساتھ یہ مجھ کو خبر نہ تھی (۲۲) جی بھر کے پیار بھی تو نہ کر پائی میں ابھی
یہ دکھ تمام عمر مجھے کھائے جائے گا
یہ لمحۂ فراق بہت یاد آئے گا

جاتے ہو رن کو ٹھہرو میں گیسو سنواروں گودی میں آؤ تم کو میں جی بھر کے پیار دوں
رک جاؤ میرے لعل کہ صدقہ اتار دوں (۲۳) میں کیوں نہ اپنے آپ کو تم پر سے وار دوں
اپنی امان میں رکھے تمھیں ربِّ ذوالجلال
جاؤ سدھارو رن کی طرف میرے نونہال

سر کو جھکائے رن کی طرف آئے شاہِؑ دیں قرآں کی طرح ہاتھوں پہ تھا طفلِ مہ جبیں
لے کر سہ شعبہ تیر اُدھر سے بڑھا لعیں (۲۴) منظر بیان ہوسکے ، لفظوں میں دم نہیں
ثابت ہوا عدو میں مسلماں نہ تھا کوئی
مسلم تو دور ان میں تو انساں نہ تھا کوئی

اصغرؑ گواہِ تشنگیٔ سبطِ مصطفےؐ اصغرؑ سے حق کا تابہ ابد ملتا ملتا ہے پتہ
سوکھے لبوں پہ ہے جو تبسم حسین سا (۲۵) اعلان تابہ حشر ہے وہ حق کی جیت کا
بچہ جب اپنے باپ پہ قربان ہوگیا
شبیرؑ کے بھی قتل کا سامان ہوگیا

عرفانؔ ہے منتقم ہی کو حق انتقام کا ہے منتقم حسینؑ کے خوں کا تو خود خدا
خونِ حسینؑ ابنِ علیؑ کا مقدمہ (۲۶) جب بارگاہِ منصفِ عادل میں جائے گا
تب انتقام خالقِ قہار دیکھنا
دہشت سے چیخ اٹھے گی خود نار دیکھنا

۞۞۞

سلام

پروین حیدر

یزیدیت سے کھلی جنگ ھے مری تحریر
حسینیت سے ہم آہنگ ہے مری تحریر

لکھی ھے میں نے لہو رنگ روشنائی سے
اسی لیے تو لہو رنگ ھے مری تحریر

حدیثِ عشق کو میثم قریبِ منبرِ دار
بیان کرتے ہیں اور دنگ ھے مری تحریر

کیا ھے حرف کو تصویر کتنے رنگوں سے
نگار خانۂ ارژنگ ہے مری تحریر

وہ شام جس میں کہ آہوں کی تھی عزاداری
اسی کے غم میں شفق رنگ ھے مری تحریر

مرا قلم ہے ازل سے مزاج دارِ الم
کتابِ درد کی فرہنگ ھے مری تحریر

وہ ایک پیاس دمِ تشنگی جو یاد آئی
اسی کی یاد میں خوں رنگ ھے مری تحریر

اُکھاڑ ڈالا جو زہرؑا کی قبرِ اطہر سے
زمینِ دل پہ وہی سنگ ہے مری تحریر

دیا ہو جس نے مرے لفظ کو نیا آہنگ
ہر اس کتاب کے پاسنگ ہے مری تحریر

وصال و ہجر عطش عشق و انتظار و فغاں
بہم ہوئے تو ہمہ رنگ ہے مری تحریر
فرشتگانِ حساب و کتاب کو ہو نوید
تہہِ مزار مرے سنگ ہے مری تحریر

مرثیے کی تنقید اور بنگال

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

اردو شاعری میں مرثیے کی بڑی توانا روایت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو شاعری میں غزل کے بعد کسی دوسری صنف کو اس حد تک درجۂ اعتبار حاصل ہے کہ اسے زبان کی پہچان قرار دیا جاسکے تو وہ صنف مرثیہ کے سوا دوسری صنف نہیں ہوسکتی۔ مرثیہ تحقیق یا رثائی تحقیق پر ہمارے نقادوں اور محققوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان نقادوں اور محققوں کی زیادہ تر توجہ لکھنوی مرثیے خصوصاً انیسؔ و دبیرؔ کی طرف رہی۔ حالانکہ برصغیر کے دوسرے حصوں میں بھی مرثیے کو فروغ حاصل ہوا ہے خصوصاً دکن میں جہاں مرثیہ گوئی کی ایک مضبوط روایت رہی ہے اور ان کے مرثیے مطبوعہ اور قلمی شکل میں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح دہلی میں بھی مرثیہ گوئی کی مسلسل روایت ملتی ہے۔ بعد میں دہلی کے شعرا نے محمد علی وردی خان اور سراج الدولہ کے عہد میں مرشد آباد کا رخ کیا اور بنگال کی ادبی فضا کو استوار کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے وقتاً فوقتاً شیراز ہند جونپور، عظیم آباد، پٹنہ، مرشد آباد، فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور جان عالم واجد علی شاہ کی کلکتہ ہجرت کے بعد مٹیا برج کلکتہ کا رخ کیا اور وہاں ادبی و لسانی خدمات کے ساتھ مرثیے کی مستحکم تاریخ مرتب کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ تنقید کی تعریف کرتے ہوئے قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

''تنقید مطالعۂ ادب کا ایک مخصوص علم ہے، جس کے اپنے متعین اصول، طریقۂ کار اور ذیلی شاخیں (نظری، عملی اور تقابلی تنقید) ہیں۔ ان میں ہر دبستان کے اپنے منفرد نظری و عملی جہات اور تصورات ہیں جن سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔''

قاضی افضال حسین کے درج بالا اقتباس کی قرأت کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر و ادب اور تنقید کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا گہرا ہے کہ ایک کے بغیر دوسروں کا تصور کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ایک نقاد ہمیشہ قاری کے ذہن میں اترنے کی کوشش کرتا ہے اور فنکار کے عہد کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی محاسن و معائب کا تعین کرتا ہے، نیز فن پارے کی تشریح کرتا ہے۔ ایک سچا تنقید نگار وہی ہوتا ہے جو کسی فن پارے سے متعلق ذہن میں جو تاثرات ابھرتے ہیں، انھیں بیان کردے نیز لفاظی سے دور رہ کر اپنی استعداد کے مطابق فن پارے کے مثبت و منفی صورت حال کی جستجو کرے اور اپنے عمل اور ردعمل کا اظہار بھی۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں انہیں معروضات کو اصطلاحی پیکر عطا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کی روشنی میں ادب کو پرکھنے کا نام تنقید ہے۔''

جہاں تک رثائی ادب کی تنقید کا تعلق ہے، غزل، نظم، افسانہ، ناول اور ڈرامے کی تنقید سے یکسر مختلف اور قدرے مشکل ہے۔ یہ واحد صنف سخن ہے کہ دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں اس کا بیشتر تخلیقی سرمایہ غیر مطبوعہ حالت میں ہے۔ عہد حاضر میں اگرچہ اشاعتی سہولتیں زیادہ میسر ہیں لیکن مرثیوں کے ذخیرے کا کم و بیش نوے فیصد سے زیادہ اثاثہ اب بھی ایسا ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

مرثیے کے مشہور پارکھی اور رثائی تنقید کے معتبر ناقد ڈاکٹر ہلال نقوی نے مرثیہ کی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اردو مرثیے کے بارے میں جو بھی نثری سرمایہ ہمارے سامنے ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرثیے سے متعلق بیشتر تحقیق وتنقید افراط وتفریط کا شکار رہی ہے۔ وقتی مضامین اور تبصروں میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں لکھنے والوں کا رویہ غیر ذمہ دارانہ ہے۔ آج بھی مرثیوں کے جو مجموعے سامنے آتے ہیں ان میں بعض کے دیباچوں، مقدموں خصوصاً فلیپ پر جن خیالات کا اظہار ملتا ہے وہ عموماً مصلحتی تقاضوں کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض ایسے حضرات کی بھی رائے ان فلیپوں پر شائع ہوتی ہے جنھوں نے میر انیسؔ کے کسی ایک مرثیے کو شاید ہی غور سے پڑھا ہو۔''

ادب کی ہر صنف کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے زبان اور مواد سے ہی گفتگو کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اردو مرثیہ کو بھی تنقید کی کسوٹی پر پرکھا اور کسا جاتا رہا ہے۔ اردو کے پہلے نقاد حالیؔ نے بھی اپنے مقدمہ میں جہاں جملہ اصناف سخن کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہیں اردو مرثیہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس بات سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رثائی تنقید کی باضابطہ اولین کوشش علامہ شبلی نعمانی کی ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' ہے جس نے اردو میں تقابلی تنقید کو رواج دیا۔ پروفیسر فضل امام نے جہاں علامہ شبلی نعمانی کی اس راہ میں اولیت کا اعتراف کیا ہے وہیں وہ ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' کی جہتوں کو فی نفسہٖ موزوں ومناسب نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ ''دونوں شاعروں کی نہادِ فکر ہی مختلف ہے تو موازنہ کس کام کا۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ ''ردالموازنہ'' اور ''المیزان'' تک نوبت پہنچی۔ لیکن اس افراط وتفریط کے باوجود وہ شبلی کی مخلصانہ کوشش کے معترف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''تمام تر اختلافات وتردیدات کے باوجود موازنہ کو انیسؔ شناسی کا سرخیل تسلیم کیا جائے گا۔''

شبلی کے علاوہ محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں مرثیہ پر اپنے خیالات پیش کیے لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ ہمارے ناقدینِ ادب نے اس سے بے اعتنائی برتی۔ موجودہ عہد کے مشہور ترقی پسند ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے ایک مضمون میں یہ سوال قائم کیا کہ:

''اردو تنقید یا ہمارے نقادوں نے جتنی توجہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ یا بعض دوسرے شاعروں اور فنکاروں پر دی۔ انیسؔ پر کیوں نہیں دی۔ مقدار ومعیار کے اعتبار سے تنقید کی جتنی کتابیں متذکرہ بالا شعراء پر ملتی ہیں انیسؔ پر نسبتاً کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر تحقیق سے متعلق ہیں اور جو تنقید ہے بھی ان میں وہ حقیقت، بصیرت اور معروضیت کم دیکھنے کو ملتی ہے جو صف اول کی تنقید کا معیار وشعار رہی ہے۔''

پروفیسر علی احمد فاطمی نے رثائی تنقید کے حوالے سے جو سوالات قائم کیے ہیں وہ صد فیصد درست ہیں۔ اس لیے کہ ہماری تنقید رثائی تنقید کے میدان میں تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہے جس کا احساس عاشور کاظمی کو بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ رثائی ادب، ایک باقاعدہ اور اہم صنف سخن ہے لیکن ناقدین نے عام طور پر اس شاعری کو ادب کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے مجالس میں گریہ وزاری کی محرک شاعری کا درجہ دے دیا۔''

پروفیسر احتشام حسین ادبی تنگ نظری کو فنکار پر ظلم تصور کرتے ہیں، جبکہ علی احمد فاطمی نے ترقی پسند ناقدین سے بھی شکوہ کیا ہے کہ ''ترقی پسند تنقید نے بھی مرثیہ اور انیسؔ پر وہ توجہ نہیں دی جس کے یہ مستحق ہیں۔'' علی احمد فاطمی نے اس کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں اور اپنی بات کی تطبیق کے لیے پروفیسر احتشام حسین کے ''مطالعہ انیسؔ'' کے درج ذیل اقتباسات کا سہارا لیا ہے:

''عالمی ادب پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض ادیب اور شاعر محض اس وجہ سے اپنا صحیح مقام نہ حاصل کر سکے کہ ان کے موضوع پر

تنگ خیالی سے نگاہ ڈالی گئی اور اس کے صرف ایک رخ کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کی اپیل محض ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فنی صلاحیت، شاعرانہ بصیرت، تخلیقی قوت اور قدرتِ بیان کا اعتراف بھی دبی زبان سے کیا گیا۔ اس حیثیت سے میر انیس کا شماران فنکاروں میں ہوتا ہے جن کا سرمایۂ شاعری مسلمانوں کے ایک خاص فرقے کے لیے وقف ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کے فنکار اور شاعر پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہوسکتا کہ اس کے پُرخلوص انتخابِ موضوع کو اس کی مذہبیت یا تنگ نظری پر محمول کر کے اس کے شاعرانہ عظمت کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے۔''

پروفیسر احتشام حسین فنکار کے پُرخلوص انتخاب موضوع کی مذہبیت یا تنگ نظری کو مرثیہ تنقید سے بے اعتنائی کا سبب بتاتے ہیں۔ دوسری طرف پروفیسر فضل امام اسے مرثیہ ناقدین کی افہام وتفہیم کے باب میں افراط وتفریط کو وجہ قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ہمارے مغربی ادب سے متاثر اردو ناقدین نے اردو مرثیے کو مغربی شعروادب کے کینوس میں دیکھنے کی ناکام کوشش کی تو انھیں پہلی ہی فرصت میں بے ربطی نظر آئی۔ خاص کر ڈاکٹر احسن فاروقی، اطہر علی فاروقی اور کلیم الدین احمد وغیرہ نے مغربی ناقدین کے مقالے اور رائیں ازبر کر کے، اپنے طور پر کانٹ چھانٹ کر زبردستی نئے نئے پہلو اعتراضات کے نکالے جس کے جواب میں بہت سارا زورِ صرف کیا گیا چنانچہ نواب جعفر علی خاں اثر، علی عباس حسینی، پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر شبیہ الحسن اور پروفیسر سید عقیل وغیرہ نے استدلالی جواب سے استنباط کیے۔''

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے مرثیہ تنقید میں افراط وتفریط کی وجہ کچھ یوں بیان کی ہے:

''اب تک مرثیے کی تنقید میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا تو تاریخی اور تحقیقی محاسبے ہیں یا پھر تنقید کے ان مشرقی اصولوں سے مرثیے کو جانچا گیا جو اس وقت کے تنقیدی معیار تھے۔ کبھی محض اعتراض برائے اعتراض تو کبھی الفاظ ومحاورات کے صرف کی باتیں۔ کبھی ایک مضمون یا خیال کو جو مختلف مرثیہ نگار مختلف طریقوں سے یا اپنے انفرادی سلیقے کے ساتھ نظم کرتے رہے ہیں۔''

مرثیہ تنقید میں ڈاکٹر مسیح الزماں ایک ایسا نام ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ سائنٹفک طریقۂ کار اپناتے ہوئے اس کے فنی رموز پر گفتگو کی۔ انھوں نے مرثیے کی فنی قدروں کا جہاں اعتراف کیا وہیں ناقدین ادب کی اس صنف سے دوری اور اس کے معروضی جائزہ سے راہ فرار کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ انھوں نے لکھا:

''انیسویں صدی عیسوی کی ادبی بیداری نے اگرچہ اس صنف کے ارتقا اور عروج میں نمایاں حصہ لیا لیکن ایک طرف اسے اپنے موضوع کی وجہ سے صرف مسلمانوں اور مسلمانوں میں بھی اہل بیت رسولؐ سے محبت وعقیدت رکھنے والوں کے حلقے کی چیز سمجھا گیا، دوسری طرف مذہبی تقدس اور معتقدانہ تصورات کی تسکین سے وابستہ کر کے اسے فن کے تقاضوں سے ماورا خیال کیا گیا۔ اس لیے اس کی ادبی حیثیت نمایاں نہیں ہوسکی۔''

ڈاکٹر مسیح الزماں مرثیہ تنقید میں بنگال کے رول کو اہم بتاتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عبدالغفور نساخ نے ''انتخاب نقص'' میں جب انیس اور دبیر کے کچھ مرثیوں پر اعتراض کیے تب سے کچھ لوگوں کی توجہ ادھر گئی لیکن ''تطہیر الاوساخ فی نسخ النساخ'' اور منیر شکوہ آبادی کے ''سنان دل خراش'' وغیرہ میں بیشتر الفاظ اور قافیے زیر بحث آئے ہیں۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کا خیال ہے کہ ''مرثیہ کے معنوی پہلوؤں پر غور کرنے کی طرف آب حیات، مقدمہ شعروشاعری (مقدمہ دیوان حالیؔ) اور موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ نے مائل کیا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں شبلی کی عظمت کے بھی

قائل ہیں۔انھوں نے لکھا ہے کہ'' آخرالذکر کتاب نے ردالموازنہ،المیز ان وغیرہ لکھنے کی طرف لوگوں کو اکسایا جس میں مناظرے کا رنگ زیادہ ہے۔'' درج بالا صورت حال کے باوجود ڈاکٹر مسیح الزماں اس بات کے معترف ہیں کہ ''لوگوں کی توجہ مرثیہ کے ادبی پہلوؤں کی طرف مرکوز ہوئی جسے '' کاشف الحقائق'' کی ایسی کتابوں سے تقویت ملی۔''

ڈاکٹر مسیح الزماں اس بات کے شاکی ہیں کہ مرثیہ تنقید انیسؔ و دبیرؔ ہی کے گرد گھومتی رہی اور سچائی تو یہ ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کے ساتھ بھی ہماری تنقید نے انصاف نہیں کیا۔موازنہ میں شبلی کے بیان کردہ بہت سے مفروضات آج بھی نئی نسل کو انیسؔ و دبیرؔ کے فن کی عظمت سے دور رکھے ہوئے ہیں۔موازنہ کے جواب میں لکھی گئی کتابیں قاری سے دور ہونے کے سبب مرثیہ تنقید پر انیس و دبیر کے حوالے سے بھی خاطر خواہ کام نہ ہوسکا اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

''دوسری کتابوں میں توجہ کا مرکز انیسؔ و دبیرؔ ہی رہے چنانچہ مرثیے کا مطالعہ اور جائزہ بیشتر انہیں مرثیہ گویوں کے گرد گھومتا رہا۔حیاتِ انیسؔ،حیاتِ دبیرؔ،یادگارِ انیسؔ،واقعاتِ انیسؔ میں بھی انھیں کے قصے بیان کیے گئے۔''

ڈاکٹر مسیح الزماں اس صورتِ حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ادبی بے اعتنائی کی شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو کہ فنی محاسن سے اس قدر مالا مال صنف سخن تحقیق و تنقید،تبصرے اور جائزے کے احاطے سے دور پڑی رہے،اس کے بہت سے نمایاں اور ممتاز شعراء کا کلام نایابی کی حد تک کمیاب ہو اور ان کے حالات زندگی،ادبی خدمات طرز کلام وغیرہ پر تقریباً کچھ بھی نہ لکھا گیا ہو۔''

مرثیہ تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ:

''انیسؔ و دبیرؔ کے عہد مرثیہ گوئی کی سب سے نمایاں اور روشن تر خوبی یہ تھی کہ مرثیہ اب محض مرثیے کی تاریخ میں نہیں بلکہ شاعری اور ادب کی تاریخ میں موضوع بحث بن گیا۔اس کے مدھم نقوش تو سودا ہی کے زمانے میں ابھرے لیکن انیسؔ کے قلم نے تو دنیا ہی بدل دی۔محمد حسین آزادؔ،حالیؔ اور شبلیؔ جیسے لکھنے والوں نے بہت سنجیدگی سے اس صنف سخن کے متعلق بات کی۔''

محمد حسین آزاد،حالی اور شبلی کی مرثیہ پر ناقدانہ نظر نے مرثیہ تنقید کے کینوس کو وسیع کیا ادب کا قاری اس صنف کے مطالعہ پر سنجیدہ ہوا اور بقول پروفیسر احتشام حسین:

''لکھنؤ میں مرثیے کو جو ترقی ہوئی اس نے پوری اردو شاعری کی حدوں کو وسیع کر دیا اور لکھنؤ میں جو انحطاط پیش قدمی کر چکا تھا اس کو روک کر شعری تخلیق کے نئے دروازے کھول دیے۔''

مرثیہ تنقید پر لکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر بھی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے کہ اردو شاعری کے نقاد حضرات نے مرثیہ گو شعراء کو کمتر درجے کا شاعر قرار دینے کی مسلسل کوششیں کی ہیں۔'' بگڑا شاعر مرثیہ گو'' کی کہاوت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے جبکہ مرثیہ کسی دوست،عزیز، قومی ہیرو،مذہبی رہنما کی موت پر غم واندوہ کے اظہار کی حزنیہ شاعری کا نام ہے۔ڈاکٹر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ:

''مرثیہ عموماً اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مذہبی یا قومی پیشوا یا کسی محبوب شخصیت کی موت پر اظہار غم والم کیا گیا ہو اور اس کے صفات کا بیان اس طرح سے کیا جائے کہ سننے والے بھی متاثر ہوں۔''

مرثیہ کی تعریف اور اس کے اقسام کے حوالے سے راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو میں شخصی مرثیے کی روایت'' میں تفصیلی بحث کی

ہےلیکن پروفیسر احتشام حسین کے درج ذیل اقتباس سے اس کے موضوعات واسالیب پر مزید روشنی پڑتی ہے:

''اردو میں زیادہ تر مرثیے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے بارے میں کہے گئے ہیں جو مسلمانوں کے رسولؐ کے نواسے تھے اور جن کو نام نہاد خلیفہ اور بادشاہ یزید نے کربلا کے میدان میں تین دن کا بھوکا پیاسا رکھ کر بڑی بے رحمی کے ساتھ شہید کر دیا۔ مرثیے میں اسی حادثے کو بڑی پسندیدہ اور دلدوز صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔''

مسعود حسن رضوی ادیب مرثیہ تنقید کا ایک ایسا نام ہے جنھوں نے مرثیہ تنقید کے ساتھ ساتھ مرثیہ تحقیق پر بہت زیادہ کام کیا ہے۔ انھوں نے میر انیسؔ کے علاوہ دیگر مرثیہ نگاروں پر اہم کام کیا اور ان کے کلام کو محفوظ کر دیا ہے۔ انھوں نے رثائی تحقیق پر جو کام کیا ہے وہ تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید پر بھی لائق توجہ ہے۔ ''روحِ انیسؔ'' کے مقدمہ میں انھوں نے جن تنقیدی مباحث کے در وا کیے ہیں وہ ایک طرف شبلی کی تنقیدی روش کی توسیع ہے تو دوسری طرف مرثیہ تنقید کے لیے رہنما اصول بھی ہیں۔ پروفیسر انیس اشفاق نے ''روحِ انیسؔ'' کے مقدمے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس نکتے کی نشاندہی کی ہے:

''روحِ انیسؔ، کا اصل مقصد اور اہم مقصد دراصل آخری مقدمہ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ مقدمہ ہے جس نے مرثیے کے آئندہ کی تنقید کے لیے رہنما اصول مقرر کیے۔ نو صفحات پر مشتمل اس مختصر مقدمے نے ایک طرف مرثیے کی تنقید کے لیے اصول سازی کا کام انجام دیا اور دوسری طرف مرثیے کی تحسین و تعبیر کے آداب سے بھی روشناس کرایا۔''

مرثیے کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے آخری دور اور بیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں، ان پر انیسؔ اور دوسرے مرثیہ نگاروں کے افکار و اثرات منضبط ہو رہے تھے۔ اردو تنقید میں مرثیہ تنقید کو بھی جگہ دی جا رہی تھی جس کی آبِ حیات، مقدمہ شعر و شاعری اور موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ سب سے نمایاں مثالیں ہیں۔ لیکن مذکورہ تنقیدی خیالات سے پہلے ہمارے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ تنقید کی شعوری کوشش کی اور اپنے خیالات سے ثابت کیا کہ مرثیہ فن کی کسوٹی پر کھرا اترنا چاہیے۔ مرثیے سے متعلق تنقیدی خیالات ان کتابوں سے پہلے ہمیں خود مرثیہ نگاروں کے کلام میں ملتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے شاعر سید عبدالولی عزلت (۱۷۷۵ء) اور رضا گجراتی اس حوالے سے قابل ذکر ہیں۔ سید عبدالولی عزلت کا تعلق مرشدآباد بنگال سے بھی تھا اور مرشدآباد میں انھیں مرثیہ نگار کی حیثیت سے اہم مقام حاصل تھا۔ عزلت نے ایک مرثیے میں اپنے نقطۂ نگاہ کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

خام مضمون مرثیہ لکھنے سوں چپ رہنا بھلا
پختہ درد آمیز عزلتؔ نت تو احوالات بول

عزلت کا درج بالا شعر مرثیہ نگار کے پختہ شعور کا غماز ہے۔ عزلت خام مضمون نظم کرنے سے نہ کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ مرثیہ کی شعریات کو وہ لفظی و معنوی سطح پر پختہ اور درد آمیز الفاظ سے مزین دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اسی عہد کا مرثیہ گو شاعر رضا گجراتی اس سے اختلاف کرتا ہے۔

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیے میں یوں کہا
''خام مضموں مرثیہ لکھنے سوں چپ رہنا بھلا''
لیکن اس مظلوم بے سرکا بیاں کرنا روا
تا کہ سن کر یوں بیاں ہو ویں محبّاں اشکبار

جمیل جالبی نے رضا گجراتی کے اس بند پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مرثیہ گو رضا کے یہاں ادبی وشعری سطح مرثیے کے لیے بے ضرورت ہے۔'' اس کا اصل مقصد تو ''مظلوم بے سر کے بیان سے اشکبار کرنا ہے۔'' ڈاکٹر ہلال نقوی نے مصحفی (تذکرہ ہندی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''علی قلی خاں ندیم شمالی ہند کا وہ مرثیہ نگار ہے جس کے مرثیوں میں ادبیت نمایاں ہے۔ اس کا مقصد مرثیے کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا لیکن جب وہ اپنے مقصد کو مکمل ہوتا نہیں دیکھ سکا تو اس نے مرثیہ گوئی ترک کر دی اور غزل کہنے لگا۔'' ڈاکٹر ہلال نقوی کے مطابق قائم چاند پوری کو بھی مرثیے کی پستی کا احساس تھا۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ نے اگر چہ مرثیہ نہیں کہا لیکن اپنے دور کی مرثیہ گوئی کو دیکھتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا:

''دریں ولا اکثر موزونان ہند کہ قوت شعر در طبیعت ندارند برائے شہرت وممدوح شدن در جاہلاں وجذب منافع از امرائے سخیف الرائے شروع بہ مرثیہ گوئی کنند۔''

ترجمہ: اس ضمن میں ہندوستان کے زیادہ تر شعر موزوں کرنے والوں نے جو طبعی طور پر شعر کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور جاہلوں کے ممدوح بننے اور شہرت حاصل کرنے اور نحیف الرائے امرا سے انعام واکرام حاصل کرنے کی غرض سے مرثیہ کہنے لگے۔ (عابد حیدری)

عزلت، محمد رضا گجراتی، علی قلی خاں ندیم، قائم چاند پوری اور انشاء اللہ انشاء سے قطع نظر مرثیہ تنقید میں سودا کی شخصیت زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مرثیہ گو شعراء کی بے راہ روی اور ان کے طرز مرثیہ گوئی کی دھجیاں بکھیرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انھوں نے اپنے دور کے ایک مرثیہ گو میر محمد تقی عرف میر گھاسی کے ایک مرثیے پر بہت کڑی تنقید کی۔ انھوں نے میر گھاسی کے مرثیے سے متعلق تمام صورت حال کا ذکر اپنی کلیات میں ''سبیل ہدایت'' کے عنوان سے لکھے گئے اشعار میں کیا ہے۔ اس نظم کے حوالے سے ڈاکٹر ہلال نقوی رقم طراز ہیں:

''اس نظم کے ذریعے سوداؔ نے مرثیے کے ایک ادبی صنفِ سخن ہونے کا شعوری احساس دلایا۔''

اس نظم کے علاوہ سودا نے میر گھاسی کے مربع مرثیہ پر منظوم اظہار خیال کر کے مرثیہ تنقید کی مضبوط وتوانا روایت کا راستہ ہموار کیا اور اس بات کا شعوری ثبوت پیش کیا کہ مرثیہ کا شاعر تخلیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی نظر بھی رکھتا ہے۔ سودا نے مذکورہ مرثیے میں عروضی خامیوں، شعری سُقم، محاورے کی اغلاط، وزن وبحر میں جھول، بندش کی سستی، یہاں تک کہ خانوادۂ رسولؐ کے کرداروں کی رتبہ شناسی پر بھی توجہ دلائی۔ انھوں نے کہا:

غرض مرثیہ یہ جو تم نے کہا ہے　　عجب بحر بے ربطی اس میں بہا ہے
بلاغت کا جی ناک میں آرہا ہے　　فصاحت کو دیکھو تو وہ جاں بلب ہے

سوداؔ کا مذکورہ جوابی مرثیہ اٹھارہویں صدی کی مرثیہ گوئی کی تاریخ میں پہلی منظوم تنقیدی دستاویز ہے، جس میں بیسویں صدی کی مرثیہ گوئی کے بعض زاویے کروٹیں لیتے نظر آتے ہیں۔ سودا نے بہت زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ:

''پس لازم ہے کہ مرتبہ درنظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبط تضحیک وقصد بکا میں رہیں۔ اس کا سیاق وسباق جہلا دریافت کریں اور پھوٹ بہیں:

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں روپوش
یاں تلک رتبۂ سخن پہنچا

مرثیہ تنقید میں سوداؔ کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے قطع نظر انھوں نے ہیئتی تجربات سے مرثیے کو جو وسعت دی وہ اس دور کے دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتی۔ ان کے مرثیے منفرد، مستزاد، مستزاد منفرد، مثلث، مثلث مستزاد، مربع، مربع مستزاد، ترکیب بند، ترجیع

بند، مخمس، مخمس ترکیب بند، مخمس ترجیع بند، مسدس، مسدس ترکیب بنداوردوہرہ کی ہیئت میں ملتے ہیں۔سوداؔ کے تنقیدی خیالات اور ہیئتی تجربات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارا مرثیہ نگارفنی رموز سے آشنا ہے اورغزل، مثنوی اور قصیدہ کی طرح مرثیہ میں بھی فنی سقم کا قائل نہیں ہے۔

اردو مرثیہ کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہماری شعری روایت جہاں دکن سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ کا سفر کرتی ہے وہیں ہمارا یہ ادبی کارواں بنگال و بہار کی طرف بھی بار ہا گیا ہے۔مہابت جنگ محمد علی وردی خاں اور سراج الدولہ اور بعد میں جانِ عالم واجد علی شاہ کے ٹمیا برج کلکتہ میں قیام کے دوران دہلی اور لکھنؤ کے صاحبان کمال نے اس سرزمین پر بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔مرثیہ تنقید کے حوالے سے پہلا نام عزلت کا ہماری مرثیہ تاریخ اور اس کی تنقید میں محفوظ ہے، اس کا تعلق بھی بنگال سے ہے۔عزلت کا قیام مرشدآباد اور وہاں کی عزاداری اور مرثیہ خوانی کے شواہد اس بات کے گواہ ہیں کہ بنگال کی سرزمین مرشدآباد ادبی دبستان بننے کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کا مرکز بن چکی تھی۔علی وردی خاں کی شعرا وادبا کی سرپرستی نے عزلت، علی قلی خاں ندیم جیسے شعراء کو قیام مرشدآباد پر مجبور کیا لیکن سراج الدولہ کی شہادت کے بعد، بنگال خصوصاً مرشدآباد کی معیشت کے ساتھ ساتھ علمی اثاثے کو بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔اولادحسین شاعرلکھنوی کے مشہور مرثیہ ''تاریخِ مرثیہ'' کے درج ذیل بند میرے درج بالا جملوں کی تطبیق کرتے نظر آتے ہیں کہ جوشؔ، جمیلؔ مظہری اور آلِ رضاؔ کا ہم عصر شاعر بھی بنگال کی اس ادبی فضا کا مرثیہ خواں ہے جس کا مرکز مرشدآباد تھا:

حق نے اسلام کو جو دی تھی وہ دولت نہ رہی شکر نعمت نہ کیا ہم نے تو نعمت نہ رہی
تاجِ شاہی نہ رہا شوکت و حشمت نہ رہی اس قدر بگڑے کہ پہلی سی طبیعت نہ رہی
خویش کش نام ہوا غیر کے محتاج ہوئے
جن کے سر رہتے تھے قدموں میں وہ سرتاج ہوئے

مرشدآباد کی دولت کو مٹایا ہم نے خود سراجِ رہِ بنگال بجھایا ہم نے
شیرِ میسور کو کانٹوں میں پھنسایا ہم نے راستہ قلعے کا غیروں کو بتایا ہم نے
شعلہ در نار حسد ہوگئی غداری سے
اپنا گھر پھونک دیا اپنی ہی چنگاری سے

اولادحسین شاعرلکھنوی کے درج بالا بند اس بات کے گواہ ہیں کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد دہلی میں مغلوں کا سنہرا دور زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا اور مملکت میں شاہی اقتدار واختیارات میں انحطاط واقع ہونے لگا۔دہلی سے اہل حرفہ کے ساتھ اہل علم، شعرا، ادبا وعلماء کی ایک بڑی تعداد ہجرت پر مجبور ہوئی۔اس طوائف الملوکی کے دور میں کچھ لوگوں نے جہاں دکن کا رخ کیا تو اکثر نے سرزمین بنگالہ کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔اصغرانیس نے لکھا ہے:

''بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار نے دہلی اور اس کے قرب وجوار میں بھیانک تباہی وبربادی پھیلادی۔دلی کی آہ وبکا کی دل خراش صدائیں بلند ہورہی تھیں جبکہ لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشدآباد میں شادیانے بج اٹھے۔مروجہ حالات کے تحت شمالی ہند سے بہتر مستقبل اور سہولیاتِ زندگی کے متلاشی افراد نے جوق درجوق لکھنؤ اور عظیم آباد ہوتے ہوئے مرشدآباد کو منزل مقصود بنایا۔''

واقعۂ کربلا اور اس کی حقانیت نے ہر دور کے ادب کو متاثر کیا ہے۔ دنیا کے ہر ادب میں اس کی مستحکم روایت موجود ہے، اس لیے کہ رثائی شاعری یا کربلائی شاعری انسانی رشتوں کی شاعری ہے۔ یہ منفرد شاعری ہے جو ہر دور کے انسان سے ہم کلام ہے۔ لکھنے والا کسی مسلک کا ہو لیکن اس کی رثائی شاعری کا جو تہذیبی آہنگ ہے اس کا کوئی مسلک نہیں۔ راقم الحروف نے اپنے مضمون ''اکیسویں صدی میں بنگال کا رثائی ادب'' میں اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رثائی ادب کی تخلیقی توانائی میں شاعری کی جو کرشمہ سازیاں ہیں وہ اردو ادب کے لیے ایک ایسا ابدی خزانہ ہیں جن کے نقوش مٹائے نہیں جاسکتے۔ رثائی ادب کل کا ہو یا آج کا اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ رثائی ادب خواص کے لیے لکھی جانے والی شاعری نہیں ہے، بلکہ وہ شاعری چاہے مرثیہ کی شکل میں ہو یا نوحہ و ماتم کی شکل میں، اس میں عوام بالخصوص مستضعفین یا آج کی اصطلاح میں دلت اور پسماندہ عوام کے دل دھڑکتے نظر آئیں گے۔''

مغربی بنگال کے مشہور محقق و ناقد اصغر انیس نے بھی اعتراف کیا ہے کہ ''واقعۂ کربلا نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں کردار نبھایا ہے بلکہ ہماری تہذیب کو استوار کرنے اور جذبۂ انسانیت کو فروغ دینے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوا ہے۔'' انھوں نے مزید لکھا ہے کہ ''مرشدآباد میں سیدالشہداؑ کی عزاداری نے بھی یہاں اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم رول نبھایا ہے۔'' انھوں نے اپنی تصنیف ''مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز مرشدآباد'' میں ایک حصہ ''رثائی کلام'' کے عنوان سے مختص کیا ہے۔ اس کے ابتدا میں ٦ صفحات پر مشتمل اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن مرشدآباد کے مرثیہ نگاروں یا رثائی قلم کاروں کے کلام پر تنقیدی رائے سے اجتناب کیا ہے۔ اس حصے میں رثائی کلام کے ساتھ ساتھ قصیدوں اور مناقب کے ساتھ ہی سلام، نوحہ، ماتم، گیت کے نمونے پیش کیے ہیں لیکن انھوں نے کسی مرثیہ نگار کا نہ تو مرثیہ پیش کیا ہے اور نہ ہی اس کے محاسن و معائب کی نشاندہی کی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ زیادہ تر مرثیہ یا رثائی کلام غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔ اس لیے اصغر انیس نے اسے محفوظ کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری تنقید آج بھی غزل اور نظم کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ لے دے کے نئی صدی میں فکشن پر بھی توجہ دی جارہی ہے لیکن مرثیہ تنقید آج بھی اپنے قدردانوں کا انتظار کررہی ہے۔

جہاں تک بنگال میں رثائی تنقید کی بات ہے، یہاں ابتدائی دور ہی میں عزلت، ندیم، اور انشاء کے یہاں اس کے نقوش ہی نہیں ادبی شعور کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اردو کے ساتھ ستم ظریفی یہ رہی کہ ہمارا تنقیدی سرمایہ شمال اور جنوب کے حصے میں زیادہ آیا اور بنگال کی صورتِ حال بہتر نہیں رہی۔ دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، پٹنہ، اعظم گڑھ، رام پور اور شمال کے دوسرے علاقے تنقیدی سرمایے کے زیادہ حصہ دار بنے۔ جبکہ بنگال کو صحافت سے لیکر مرثیہ تنقید میں بھی تھی لیکن بعد میں اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اشرف احمد جعفری نے اسے محققین کی کم نظری یا سہل پسندی کو سبب بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بنگال کا اردو ادب کسی بھی صنف نظم و نثر سے خالی نہیں، لیکن محققین و ناقدین کی کم نظری یا سہل پسندی کے سبب یہ سامنے آنے سے قاصر رہ گئی۔ ایسی ہی ایک صنف مرثیہ بھی ہے جس پر بہت زیادہ نہیں تو اتنی کم بھی طبع آزمائی نہیں ہوئی کہ نظرانداز کردی جائے۔''

جبکہ اردو مرثیے میں سبھی طرح کے زندہ احساسات و جذبات نظم ہوئے ہیں۔ خلوص و محبت، حوصلہ و شجاعت، جوش و غضب، غیظ و جلال، نفرت و بیزاری، بغض و عناد، حسد، بزدلی، دلیری، بے غیرتی، بے حمیتی، حمیت، صبر و ضبط، استقلال، ایثار و قربانی، عاجزی و انکساری، بے

لوث خدمات، خودغرضی، فرار وثبات، خودنمائی، خودبینی، خودفراموشی، محسن کشی، احسان مندی وغیرہ وغیرہ جذبات واحساسات کی تصویریں اردو مرثیوں میں چلتی پھرتی مل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوداؔ کے ساتھ ہی خواجہ میر امامیؔ، مرزا ہوشدار ہوشدارؔ، ظہور علی خلیقؔ، میرا کبر علی حقیرؔ، مرزا محمد اسمٰعیل طپشؔ، میر شیر علی افسوسؔ اور حیدر بخش حیدریؔ جیسے شعرا نے بنگال کے رثائی ادب کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے لیکن انیسؔ و دبیرؔ سے پہلے ہی دلگیرؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ اور خلیقؔ کے مرثیے مرشدآباد اور کولکاتہ کی ادبی فضاؤں میں رچ بس گئے تھے اور مذکورہ شعرا کے مراثی وہاں کی عزائی فضا کا حصہ بن چکے تھے۔ مذکورہ شعرا کے مراثی کے قدردان رؤسا اور نوابین لکھنؤ سے ان مرثیوں کی نقلیں منگوا کر محفوظ کر رہے تھے، جس کو ''مرشدآباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ مرتبہ ڈاکٹر محمد غزالی مطبوعہ ۲۰۰۵ء'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ پیشروان انیسؔ و دبیرؔ کی رثائی دھمک نے بنگال کو بھی متاثر کیا اور جان عالم واجد علی شاہ کی مٹیا برج کلکتہ آمد نے انیسؔ و دبیرؔ کے ساتھ ساتھ دوسرے مرثیہ نگار شعرا کو بھی قدردان رثائی ادب سے متعارف کرایا۔ مرثیہ نگاروں کے کلام کی آمد پر ناقدین بنگال نے یہاں تنقیدی مباحث کے دروا کیے اور جہاں محمد حسین آزادؔ، حالیؔ اور شبلیؔ کی مرثیہ شناسی یا مرثیہ تنقید کے مباحث سامنے آئے وہیں کلکتہ میں عبدالغفور نساخ نے اپنی خودنوشت اور پھر حرف گیریٔ اساتذہ پر مشتمل کتاب ''انتخاب نقص'' لکھی اور نساخ کا ذکر ہر علمی اور ادبی معاملات میں درک رکھنے والے شخص تک پہنچا۔ چنانچہ انھوں نے انیسؔ و دبیرؔ کو بھی اپنی بحث کا محور بنایا اور یہ ثابت کیا کہ بنگال کی سرزمین تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ مرثیہ تنقید میں بھی پیچھے نہیں ہے۔ بعض افراد نے ان کی تنقید کو مبنی بر تعصب، علاقائی جانب داری وغیرہ پر محمول سمجھا اور بعض نے ان تنقیدی مباحث میں غور وفکر کرنے کا سامان تلاش کیا۔ چنانچہ ''انتخاب نقص'' کے جواب میں محمد رضا معجز نے ''تطہیر الاوساخ فی نسخ نساخ'' لکھی۔ وہیں دبیرؔ کے شاگرد منیرؔ شکوہ آبادی نے ''سنان دلخراش'' لکھ کر مرثیہ تنقید کے دامن کو وسیع کر دیا۔ نساخ کے ''انتخابِ نقص'' کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا تھا اسی لیے موصوف کو ان کے فن میں کمی کا احساس ہوا اور چونکہ یہ کتاب اہلِ لکھنؤ کو کمتر ثابت کرنے کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے اس کے جواب میں لوگوں نے فکر کے گھوڑے اس طرح دوڑائے کہ علم پیچھے رہ گیا اور دلیل آگے بڑھ گئی۔ اس طرح مرثیہ تنقید کے سنجیدہ مباحث چیستاں بن کے رہ گئے جس کا تذکرہ ماہر دبیریات پروفیسر محمد زماں آزردہ نے بھی اپنے ایک مضمون میں کیا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ انتخاب نقص میں کیے گئے اعتراضات کے جواب میں جس طرح کے دلائل پیش کیے گئے ہیں وہ بھی منصفانہ نہیں تھے اور نہ ہی نساخ کے قائم کردہ اعتراضات میں، نیت کی درستی، خالص اور پُرخلوص نظر آتی تھی۔''

بنگال کے دوسرے ناقدین جنھوں نے نساخ پر کام کیا ہے۔ ان کی تحریریں بھی غیر متوازن محسوس ہوتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ انھوں نے انیسؔ و دبیرؔ کے کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا ہے، بلکہ دوسرے محققین و ناقدین کی گھسی پٹی باتوں کو ہی ملحوظ نظر رکھا۔ پروفیسر زماں آزردہ اس غیر متوازن تنقید سے شاکی ہیں اور انھوں نے لکھا:

''ڈاکٹر شبانہ نسرین نے اپنی تحقیقی کاوش ''نساخ اور تلامذۂ نساخ کی ادبی خدمات'' میں اس بحث پر اچھی خاصی گفتگو کی ہے۔ سید لطیف الرحمن (نساخ سے وحشت تک) اور دوسرے ناقدین اور محققین نے جا بجا نساخ کے جواب میں یا ان کے جواز میں لکھا تو ہے مگر اس گفتگو اور ان مباحث میں منصف کا کم اور وکیل کا رول زیادہ ادا کیا گیا ہے۔''

نساخ پر تحقیق و تنقید کرنے والے ناقدین کو مرثیوں کے متن کے ساتھ خصوصی طور پر سوداؔ اور انیسؔ کے ان مراثی کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے

تھا جوانھوں نے مرثیے کے فن اوران کی قدر و قیمت کے حوالے سے کہے تھے۔ گذشتہ سطور میں سودا کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ سوداؔ کے بعد انیسؔ ہی ہیں جنھوں نے مرثیے کے تعلق سے بعض بنیادی باتیں کہی ہیں جو آج پونے دوسو سال گزرنے کے بعد بھی مرثیے کی تاریخ میں دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انیسؔ نے مرثیہ تنقید کے لیے مواد فراہم کیا اور کہا ''لفظ مغلق نہ ہو، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو''۔

اور پھر مرثیہ ناقدین کو دعوت دی وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور۔

اوراس کے بعد وہ شعری ضابطہ دیا جو مرثیہ نگاروں کے لیے اکیسویں صدی میں بھی دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی لب ولہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہیں
لفظ بھی چست ہو، مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے زیب ہے خال سیہ، چہرۂ گل رو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع وہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا مختصر پڑھ کے رلادینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

انیسؔ نے درج بالا بندوں کے ذریعہ مرثیہ ناقدین کو جو پلیٹ فارم دیا اس پر ناقدین مرثیہ کھرے نہیں اترتے، جبکہ انیسؔ نے اپنے متذکرہ بندوں کے ذریعہ جہاں لب ولہجہ کی متانت، روزمرہ کی سنجیدگی، صنعتوں کی گراں باری سے گریز، بندش کی چستی، لفظ کا برمحل استعمال، اس کے مغلق اور گنجلک پن سے احتراز، تعقید سے احتیاط، موضوع ومضمون کی بلندی، ہر نکتہ مقامے دارد کی برجستگی، تخلیق کے مکمل ڈھانچے میں دبدبہ، توصیف وتعریف، مصائب میں رقت کے ساتھ مختصر پڑھ کے رلا دینے کی انتہائی سوز آفریں ہنر کی عکاسی کی ہے وہیں مرثیے کی سماجیات اور جمالیات پر بھی توجہ دینے کا اشارہ کیا ہے۔ مشہور ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے انیسؔ کے مرثیہ تنقید کے ان پہلوؤں سے آگاہی کے سبب مرثیہ ناقدین کو دوسرے موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے مرثیے کی سماجیات میں لکھا ہے:

''مرثیے کی تنقید میں مرثیے کی سماجیات ایک نئے تنقیدی مطالعے کی کوشش ہے۔ ابھی مرثیے کی جمالیات، مرثیے کی نفسیات پر جدید مغربی طرز تنقید کی مدد سے بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔''

پروفیسر عقیل رضوی کا سوچنا غلط نہیں ہے لیکن ادھر تین دہائیوں میں مرثیہ تنقید میں ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ عابد علی عابد، پروفیسر نیر مسعود، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر صفدر حسین، ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر شارب ردولوی،

پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر شبیہ الحسن، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی، ارتضیٰ عباس نقوی، ڈاکٹر عظیم امروہوی، پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر اکبر حیدری کشمیری، علی جواد زیدی، پروفیسر مجاور حسین رضوی، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر ای اے حیدری، ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی اور راقم الحروف ڈاکٹر عابد حسین حیدری اور نہ جانے کتنے نئے قلم کاروں نے مرثیے کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی اور مرثیہ تنقید کے کارواں کو آگے بڑھایا لیکن اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب مرثیہ تنقید پر لکھنے والے معدودے چند ہیں۔ پروفیسر عقیل رضوی نے ''مرثیے کی سماجیات'' میں جس خدشے کا اظہار کیا ہے اس خدشے کو مزید تقویت علی احمد فاطمی کے درج ذیل جملوں سے ہوتی ہے۔

''جمالیات ونفسیات وغیرہ کے حوالے سے مغربی طرز تنقید پر مرثیہ کی تنقید کی تلاش عقیل صاحب کی بھی اس فکر و تشویش کا اظہار کرتی ہے جو انیسؔ و دبیرؔ اور پوری اردو مرثیہ نگاری کے ساتھ برتا گیا اور اسے ایک مخصوص حلقہ کا شکار بنا دیا گیا۔''

اشرف احمد جعفری اپنے مضمون ''بنگال میں اردو مرثیہ'' میں شاکی ہیں کہ بنگال کے اردو ناقدین و محققین نے مرثیہ سے بے اعتنائی برتی۔ کسی محقق نے اگر مرثیہ گوئی کا ذکر بھی کیا تو مثالیں ندارد ہیں۔ اس افسوسناک صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''دراصل یہ افسوسناک و مایوس کن حقیقت ہے کہ بعض محققین یا تذکرہ نگار کسی شاعر کا دیوان دیکھنے کے بعد بھی اس بات کا ذکر نہیں کرتے ہیں کہ اس نے کن کن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ اول تو ان کی نشاندہی ہونی چاہیے، دوم ذکر کیا گیا ہو تو مثال میں ان کے نمونے بھی ضرور دینے چاہئیں، جبکہ اس سلسلے میں عموماً صرف غزل کے اشعار دے دیے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ رباعی نقل کر دی جاتی ہے۔ اب تحقیق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر صاحبِ دیوان شاعر کا دیوان تلاش کیا جائے، اس کا جائزہ لیا جائے اور تب پتہ چلے کہ کس کے یہاں کن کن اصناف پر اشعار ملتے ہیں۔''

اشرف احمد جعفری نے اپنے مضمون ''بنگال میں اردو مرثیہ'' میں خواجہ میر امانی سے منور رانا رزمی تک لگ بھگ ۳۵ شعراء کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں سے بہت سے شعرا نے مرثیہ نہیں کہا ہے۔ موصوف نے سلام، نوحہ، ماتم اور روایت نظم کرنے والے شعراء کو بھی مرثیہ نگار لکھ دیا ہے، جبکہ یہ تفریق ہو چکی ہے کہ رثائی شاعری کی یہ دوسری اصناف ہیں اور مرثیہ الگ صنف ہے لیکن مضمون کے آخر میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''زیر نظر مضمون اس موضوع پر کسی خاکہ سے زیادہ نہیں جس میں چند شعرا و شاعرات کے مرثیوں کے نمونے جمع تو کر دیے ہیں، ان کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔''

اشرف احمد جعفری نے اپنے مذکورہ مضمون میں خواجہ میر امانی ابن خواجہ آثمی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی معلومات عبدالغفور نساخ اور ضمیر اختر نقوی تک محدود ہے اور لگ بھگ یہی معلومات اصغر انیس نے بھی فراہم کی ہیں لیکن علی جواد زیدی نے ''دہلوی مرثیہ گو'' میں امانی پر تنقیدی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''طبیعت موزوں پائی تھی لیکن زیادہ تر مرثیے لکھتے تھے...... میر حسن سے ان کی گہری آشنائی تھی۔ انھوں نے امانی کو ''بڑی خوبیوں کا جوان'' کہا ہے...... دوستی کے باوجود حسن نے لکھا ہے کہ ان کے اشعار پختگی کو نہیں پہنچے تھے...... امانی عمر بھر مرثیے کہتے رہے۔ اپنے مرثیے خود ہی منبر پر پڑھتے تھے۔ انھیں مرثیہ خوانی کا بہت شوق تھا اور چونکہ خوش لہجہ اور خوش بیان تھے۔ اکثر لوگ انھیں محرم کے دنوں میں اپنے گھر مرثیہ خوانی کے لیے بلایا کرتے تھے۔ مرثیے بآواز بلند پڑھا کرتے تھے...... حیرت کی بات ہے کہ ایسے مرثیہ گو کے مرثیے عام طور سے

دستیاب نہ ہوں اوران سے کم تر مرثیہ گویوں کے مراثی محفوظ رہ جائیں۔''

علی جوادزیدی نے اردومرثیہ پاکستان میں مرتبہ ضمیراختر نقوی سے امانی کے مرثیے کے تین بند مربع کی ہیئت کا نقل کیا ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مراثی میں بین کا عنصر نمایاں ہے۔

''مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز مرشدآباد'' میں اصغرانیس نے صرف اتنا لکھا ہے کہ:

''علی وردی خاں کے عہد کے آغاز (۱۱۷۷ھ) آپ مرشدآباد آئے۔ یہاں کے ادبی ماحول سے آپ بہت متاثر تھے۔ بنیادی طور پر آپ مرثیہ گو شاعر تھے۔شہدائے کربلاعلیہم السلام سے آپ کی عقیدت اور گہری وابستگی کا یہ عالم تھا کہ شدت گریہ سے دوران مجلس عزا آپ پر غش طاری ہو گیااوراسی عالم غشی میں آپ راہی ملک بقا ہوئے۔''

علی جوادزیدی نے ''دہلوی مرثیہ گو'' میں مرزا ظہور علی خلیق کے والد مرزا ہوشدار، ہوشدار کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے تذکرہ نگاروں کے تنقیدی خیالات بھی پیش کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں مرثیہ تنقید اپنے مثبت راستے پر رواں دواں تھی۔اصغرانیس اوراشرف احمد جعفری نے مرزا ظہور علی ظہور کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا تو ذکر کیا ہے لیکن ہوشدار کی مرثیہ گوئی سے بے خبر ہیں۔علی جوادزیدی نے لکھا ہے:

''ہوشدار مرزا ظہور علی خلیقؔ کے والد ہیں لیکن بیٹے نے شاعری میں باپ سے زیادہ نام کمایا۔ وجہ یہ تھی کہ ہوشدار صرف مرثیہ گو تھے اور خلیقؔ مرثیوں کے علاوہ غزلیں بھی کہتے تھے۔ ہوشدار اپنے عہد کے نامی مرثیہ گو تھے۔کریم الدین اورفیلن نے انھیں مشہور مرثیہ خواں اور (تذکرہ مسرت افزا) امراللہ الہ آبادی نے مرثیہ خوانی میں یکتائے روزگار بتایا ہے۔اگرچہ مرثیے کہنے اور پڑھنے میں شہرت رکھتے تھے،لیکن دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح قواعد زبان وفن کا زیادہ دھیان نہیں رکھتے تھے۔اسی سبب احمد علی یکتا (دستورالفصاحت) نے ان کی مرثیہ گوئی کا سرسری ذکر کرتے ہوئے انہیں ''ہوش دار بے ہوش'' کہہ کر یاد کیا ہے۔''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ مسعود حسن رضوی ادیب میں ہوشدار کا قلمی مرثیہ موجود ہے جن کا ذکر کرتے ہوئے علی جوادزیدی نے ''دہلوی مرثیہ گو'' میں متعدد اشعار نقل کر دیے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اڈنبرا یونیورسٹی کی ایک قلمی بیاض کے مرثیے کے ساتھ مربع کی ہیئت میں ایک ہندی مرثیے کا ذکر کیا ہے جس کا ایک نسخہ علی جوادزیدی کی اطلاع کے مطابق ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہے۔

مرزا ظہور علی خلیق کے تعلق سے اشرف احمد جعفری نے ڈاکٹر عمرغزالی کی کتاب ''مرشدآباد لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فرہنگ'' کے حوالے سے تین مراثی اور مخطوطہ مراثی شعرائے متقدمین میں چھ مرثیوں کے صرف اولین مصرعوں کا ذکر کیا ہے۔نساخ کے مطابق آپ ۱۱۹۹ھ میں ناظم بنگالہ کی سرکار سے توسل رکھتے تھے۔اصغرانیس نے ''مغربی بنگال میں اردو کا ایک اہم مرکز مرشدآباد'' میں لکھا ہے کہ انھیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ بالخصوص فن مرثیہ گوئی میں طاق رکھتے تھے۔مروجہ دور میں مرشدآباد میں جاری مجلس عزاومحفل مقاصدہ کی روایت کو تقویت بخشنے میں انھوں نے معاون رول ادا کیا......خلیق نے اپنی حیات کا طویل عرصہ مرشدآباد میں گزارا۔ یہ دور مبارک الدولہ کی نظامت کا تھا۔ بعدازاں عراق کے کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے اور کہا جاتا ہے کہ وہیں فوت ہوئے۔'' مرزا ظہور علی خلیق کے مراثی کی مثالیں نہ تو اشرف احمد جعفری نے پیش کی ہیں اور نہ ہی اصغرانیس نے،لیکن علی جوادزیدی نے ''دہلوی مرثیہ'' (جلد دوم) میں جہاں تفصیل سے ان کے حالات وکلام پر تبصرہ کیا ہے وہیں ان کے مراثی کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔علی جوادزیدی نے ان کی شاعری کے ساتھ ان کی مرثیہ نگاری پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے:

''آدمی پڑھے لکھے تھے، عربی کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے۔ بے حد ذہین تھے۔ ہندوستانی موسیقی اور اصول ضرب یعنی 'تال' کے استاد مانے جاتے تھے اور اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ موسیقی میں ان کے کمال کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ان کا شمار بنگال کے مشہور مرثیہ خوانوں میں ہوتا تھا۔ مرثیے پڑھنے کا طریقہ خوب جانتے تھے اور اپنے طبع زاد مرثیے ایسے جاں سوز لحن سے پڑھتے تھے کہ سننے والوں کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ یہ قبول خداداد انھیں اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ مبتلا نے بھی تصدیق کی ہے کہ موسیقی اور مرثیہ خوانی میں پوری دستگاہ بھی رکھتے تھے۔''

اصغر انیس اور اشرف احمد جعفری نے شیخ علی قلی ندیم، سید عبدالولی عزلت، میر اکبر علی، میر شیر علی افسوس اور مرزا محمد اسمٰعیل طپش کی مرثیہ گوئی کا تو ذکر کیا ہے لیکن ان کے فن پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ افسوس اور طپش فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے۔ مرشد آباد کے نواب شمس الدولہ کی رفاقت کے سبب طپش کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ڈاکٹر یوسف تقی نے اپنی کتاب ''مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعرا'' میں بھی طپش کی مرثیہ نگاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ علی جواد زیدی کے مطابق ''کسی تذکرہ نویس نے بھی ان کی مرثیہ گوئی کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ان کا کلیات موجود ہے۔ اس میں دو سلام اور ایک مرثیہ درج ہے۔ مرثیہ بشکل مسدس چالیس بندوں پر مشتمل ہے۔'' علی جواد زیدی نے دہلوی مرثیہ گو (جلد دوم) میں مرثیہ کے ساتھ دونوں سلام بھی شائع کر دیے ہیں۔ مربع نما سلام کے تعلق سے انھوں نے لکھا:

''یہ مربع سلام مضامین کے اعتبار سے مرثیہ ہی ہے اور پہلے دور کے مربع مراثی کے دوش بدوش رکھا جا سکتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے مرثیہ صرف اس لیے ہو گیا کہ اس کی ابتدا 'مجرے' سے ہوتی ہے۔ اگر ابتدا میں سلام، مجرا، مجرئی، صلوٰت وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں تو عرف فنی میں اسے سلام کا نام دے دیا جاتا ہے، ورنہ اپنی اندرونی کیفیت کے اعتبار سے یہ بھی مرثیہ ہے۔''

علی جواد زیدی نے طپش کو خلیق و ضمیر و دلگیر و فصیح کا پیش رو تسلیم کرتے ہوئے ان کی سلام گوئی کے ساتھ مرثیہ گوئی پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

''اگرچہ طپش کے سلام صاف و رواں ہیں لیکن جو مرثیہ مسدس کی شکل میں ہے اس میں حشو و تعقید جا بجا نمایاں ہے۔ بیان میں تسلسل تو ہے، لیکن روانی نہیں۔ یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسدس کی بیانیہ صلاحیت ابھرنے نہیں پائی ہے اور اس کج مج بیانی کو دور کرنے کے لیے مزید مشق اور منجھائی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ سوداؔ جیسے عظیم شاعر کے یہاں نسبتاً صفائی بیان زیادہ ہے، لیکن عام شاعر طپش ہی کی طرح اس وادی میں آ کر لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ مسدس کی تزئین و تکمیل لکھنوی مرثیہ نگار شاعروں نے کی اور یہ کام خلیقؔ و ضمیرؔ و فصیحؔ و دلگیرؔ نے انجام دیا۔''

میر شیر علی افسوسؔ کا ذکر کرتے ہوئے اشرف احمد جعفری نے ''کلیاتِ افسوسؔ''، مرتبہ سید ظہیر احسن کے حوالے سے افسوس کی مرثیہ نگاری کا ذکر کیا ہے۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ ''اس کلیات میں افسوسؔ کا خاصا رثائی کلام موجود ہے۔ کچھ رباعیاں ہیں، کچھ سلام اور کچھ مراثی۔ امام حسینؑ کی شان میں نو رباعیاں ہیں۔ سلاموں کی تعداد پانچ ہے جن میں سے طویل ترین سلام بارہ اشعار اور باقی ۱۱-۱۱ اشعار کے ہیں۔ مراثی سات ہیں جن میں سے ایک مسدس ہے لیکن اس مسدس میں ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے۔''

اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک مسدس حاوی ہیئت نہیں بنا یا تھا بلکہ زیادہ مربع مرثیے کہے جا رہے تھے۔ علی جواد زیدی نے دہلوی مرثیہ گو میں رباعی و سلام و مرثیہ کے نمونے درج کیے ہیں لیکن نہ تو ان کا تجزیہ کیا ہے اور نہ ہی ان پر کوئی تنقیدی رائے پیش کی ہے۔ مذکورہ مراثی کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ مسعود حسن رضوی ادیب میں افسوس کے مراثی کی تین جلدیں محفوظ ہیں جن میں کل ۲۲۱ مرثیے موجود ہیں۔ رثائی ادب کے ممتاز اسکالر ارتضیٰ عباس نقوی (کراچی) ان کے مراثی کی جمع آوری کا کام کر رہے تھے۔ مرحوم علامہ

ضمیر اختر نقوی بھی ان کے مراثی پر کام کر رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس مرحلے میں ہے۔ کاش کوئی رثائی ادب کا غواص قلمی مراثی پر کام کر سکے اور مرثیہ تحقیق وتنقید کا حق ادا ہو اور مرثیہ تنقید کا متوازن نقطۂ نظر واضح ہو سکے۔

پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے اپنی تحقیقی کتاب ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء'' میں لکھا ہے کہ ''افسوسؔ کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور ان کے نواسے اور شاگرد میر حسن علی المتخلص بہ تاسف نے تاریخ کہی جس سے ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء سال وفات برآمد ہوتا ہے:

سال ماتم میں اس جناب کے ہے
مج تاسف کو بار بار افسوسؔ
(۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء)

اکبر حیدری کاشمیری نے افسوس کے مرثیوں پر تنقیدی نظر تو نہیں ڈالی ہے لیکن ''سفر کا حال'' کے عنوان سے مذکورہ کتاب میں چار بند پیش کیے ہیں، جو سفرِ امام حسینؑ کے تعلق سے ہے۔ مرثیہ کی بیت فارسی میں ہے لیکن اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسوس کو بین نظم کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اکبر حیدری کشمیری نے واقعۂ کربلا کے مختلف واقعات کے تعلق سے افسوس کے مرثیے کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے رفقا و اعزا کی شہادت، حضرت علی اصغرؑ کا امام حسینؑ کے ہاتھوں پر تیر سہ شعبہ کا نشانہ بننا، جناب عباسؑ و علی اکبرؑ کی شہادت کا تذکرہ اور امام حسین کی شہادت کے بعد اہلِ بیت کو دشمن کے ہاتھوں لوٹنا اور اسیر کرنا نظم کیا ہے۔

ان تمام موضوعات کو اکبر حیدری نے سلیقے سے پیش کر کے ان کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ اکبر حیدری کشمیری کا بیان ہے کہ:

''افسوس نے سلام بھی کہے ہیں ایک سلام محتشم کے رنگ میں ہے۔''

بنگال میں جب بھی تنقید کے حوالے سے گفتگو ہوگی تو حیدر بخش حیدریؔ کا نام ضرور آئے گا۔ اس لیے کہ حیدریؔ کثیر التصانیف ہیں۔ فورٹ ولیم کالج پر کام کرنے والوں نے حیدریؔ پر خاصا مواد اکٹھا کیا اور تحقیق وتنقید میں ان کی رنگارنگ قلمی خدمات کو سراہا ہے لیکن مرثیہ تنقید وتحقیق کے حوالے سے اردو ناقدین نے حیدریؔ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ علی جواد زیدی نے مختلف منابع کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''حیدریؔ کا ایک مجموعۂ مراثی بھی ہے۔ اس میں امام حسینؑ اور کربلا کے شہیدوں کے مرثیے شامل ہیں۔'' انھوں نے لکھا ہے کہ ''حیدریؔ نے ملا حسین واعظ کاشفی کی 'روضۃ الشہداء' کا ترجمہ بھی پہلے 'گلِ شہیداں' کے نام سے کیا تھا۔ پھر مولوی سید حسین علی جونپوری کی فرمائش پر اس کا انتخاب بھی 'گلِ مغفرت' کے نام سے تیار کیا۔''

حیدر بخش حیدریؔ کے مرثیوں کا نمونہ 'گلِ مغفرت' میں موجود ہے، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں رقم طراز ہیں:

''گلِ مغفرت میں حیدریؔ نے جو اپنے لکھے ہوئے مرثیے شامل کیے ہیں، ان میں دو مثنوی کی شکل میں ہیں۔ باقی قصیدہ وغزل کے روپ ہیں، چونکہ اس کتاب میں بارہ مجلسیں اس مقصد سے ترتیب دی گئی ہیں کہ انھیں ترتیب وار روزانہ عشرۂ محرم میں پڑھا جائے۔ اس لیے عزاداری کے لحاظ اس کی پہلی چار مجلسیں رسول خدا، حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ اور امام حسنؑ کے حال میں ہیں۔ چنانچہ ان مجلسوں میں جو مرثیے شامل ہیں وہ ان بزرگوں کے حال میں ہیں۔ فضلی کی کربل کتھا کی طرز پر گلِ مغفرت بھی ترتیب دی گئی ہے۔ غالباً اسی نوعیت کی وجہ سے حیدریؔ کے مرثیوں میں واقعات کربلا کے مختلف واقعات کا ذکر ایک ہی مرثیے میں نہیں ہے بلکہ غزل کی صورت میں ہوتے ہوئے بھی ان میں موضوع کی یکسانی ہے۔''

ڈاکٹر مسیح الزماں نے مرثیے کے چھ اشعار نقل کیے ہیں جس کا مقطع کا شعر ہے:

شمع ساں کر گریۂ وزاری تو اب اے حیدریؔ
رونق بزم عزا اے اشک ریزاں جائے ہے

ان اشعار پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں رقم طراز ہیں:

''ان میں جنگ کا بیان بھی ہے تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی ہے، جن میں قصیدے کی شوکت بھی ہیں، مثنوی کی روانی اور سہولت قوافی بھی۔لیکن پانچ اشعار کی پیشکش کے بعد لکھتے ہیں:

''لیکن ایسی مثالیں ایک ہی دو ہیں۔زیادہ تر مرثیے ایسے ہیں جنہیں 'نوحہ' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔''

گذشتہ سطور میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بنگال میں ابتدائی دور ہی سے تنقید کے ساتھ مرثیہ تنقید کی بھی شعوری کوشش کی گئی ہے اور یہاں کے ناقدین نے فکر ونظر کے نئے نئے گوشے وا کیے ہیں اور تاثراتی (زیادہ) اور تنقیدی (کم) انداز سے اپنے خیالات کی تشریح وتوضیح کررہے تھے۔لیکن بنگال کے تنقیدی سرمایے کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بنگال کے شعر وادب پر کام کرنے والوں نے بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے ادب پر کام کرنے والوں کی طرح رثائی ادب کے ساتھ بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا اور اس کے ساتھ بھی وہی سوتیلا سلوک کیا جیسا دوسرے ادبی مراکز نے کیا۔ورنہ مرشدآباد وکلکتہ کی مضبوط وتوانا رثائی روایت، فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا رثائی کلام اور واجد علی شاہ کی آمد کلکتہ سے شمالی ہند کے مرثیہ نگار شعراء کی دوبارہ بنگال آمد اور ان کے مراثی کا عوام وخواص میں قبول عام کے باوجود آج تک بنگال کی رثائی تحقیق وتنقید پر کوئی خاطر خواہ کام نہ ہوا۔بنگال میں مرشدآباد کی بربادی کے بعد واجد علی شاہ کی آمد کلکتہ سے ادبی تقریبات میں چار چاند لگ گئے۔بادشاہ خود قادرالکلام شاعر تھے اور شعرا کے قدردان۔ظاہر ہے ان کی قدردانی نے لکھنؤ کے ان صاحبان کمال کو ہجرت پر مجبور کیا اور ان مہاجرین میں مرثیہ نگار شعرا کی تعداد بھی کافی تھی۔بنگال میں انیسؔ ودبیرؔ کی شاعری کا ہمہمہ اور واجد علی شاہ کی اسیری کے بعد بنگال کے مٹیابرج کلکتہ میں ان کے قیام نے بنگال کی سرزمین کو دوسرا لکھنؤ بنادیا۔لکھنؤ کی بربادی اور واجد علی شاہ کی اسیری کا رنج انیس جیسے فنکار کو بھی تھا:

بس اے انیسؔ طول سے بہتر ہے اختصار ہاں ختم کرکے مرثیۂ شاہِ نام دار
خالق سے ہاتھ اٹھاکے دعا کر بہ انکسار قائم رہے جہاں میں یہ شاہِ فلک وقار
ہردم زیادہ حشمت و اقبال وجاہ ہو
حامی جناب فاطمہ زہراؑ کا ماہ ہو

انیسؔ نے جب اپنا معرکتہ الآرا مرثیہ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' نظم کیا تو واجد علی شاہ کا ذکر بھی اس مرثیے میں کیا جس میں انیسؔ نے واجد علی شاہ کی قدردانی کے ساتھ ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی اشارہ کیا ہے:

بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہیں بند بند دنیا میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے جوش میں کیا کیا بلند بند سلطاں پسند لفظ ہیں عالم پسند بند
یہ فضل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

واجد علی شاہ انیسؔ و دبیرؔ کے فن کے سچے قدر دان تھے۔ ضیاء الدین اصلاحی نے لکھا ہے کہ ''واجد علی شاہ بھی مرزا صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے اور مجلسیں پڑھواتے تھے۔ ۱۲۹۱ھ کلکتے تشریف لے گئے واجد علی شاہ بادشاہ کی خدمت میں عرض داشت بھیجی اور یہ شعر بادشاہ نے دستخط فرمایا:

گر برسر چشم من بیائی   برقلب نہم کہ کیمیائی

جب مرزا صاحب پہنچے تو بادشاہ جس مکان میں رہتے تھے، اس کے دوسرے درجے تک آکے اور پیش وائی کر کے لے گئے اور اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی کہ جیسے کوئی برابر والے کی عزت و توقیر کرتا ہے اور اپنے مرثیے میں شاہِ اودھ نے بہت سے بند ان کی تعریف و توصیف میں پڑھے جن میں یہ شعر تھا۔

بچپن سے ان کے دام سخن میں اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیرؔ ہوں

اس وقت مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر یہ مصرع پڑھا؛ ع

تعظیمِ کلام کو دبیرؔ اٹھا ہے

انیسؔ و دبیرؔ کی خلاقانہ صلاحیت اور فن مرثیہ پر ان کی دسترس نے بادشاہ سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس لیے کہ ان دونوں شعراء کے استفادے کی جھلک واجد علی شاہ اخترؔ کے کلام میں نظر آتی ہے:

تیغ مضمون کے اب تو جوہر نہ رہے   گوش بندش میں حسن گوہر نہ رہے
لو اُٹھ گئے دنیا سے دبیرؔ اور انیسؔ   افسوس کہ قدر دان اخترؔ نہ رہے

درج بالا رباعی مرثیہ تنقید میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ کوکب قدر سجاد علی مرزا نے اس رباعی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس رباعی کا آخری مصرع ہمیں یہ اطلاع بہم پہنچاتا ہے کہ صرف واجد علی شاہ ہی انیسؔ اور دبیرؔ کو گوش بندش کا درشا ہوار نہ سمجھتے تھے۔ واجد علی شاہ کے کلام پر واہ واہ کرنے والوں میں یہ دونوں بھی شریک رہے ہوں گے۔''

واجد علی شاہ اخترؔ نے سیکڑوں مراثی کے علاوہ بے شمار سلام اور نوحے کہے ہیں لیکن اس مظلوم بادشاہ کی مظلومی یہ ہے کہ ان کے کلام تک عام لوگوں کی تو کیا خواص کی بھی رسائی نہیں ہے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری پر خصوصاً ان کے مرثیوں پر بہتر طریقے سے کام نہ ہوسکا۔ منظر حسین کاظمی نے لکھا ہے کہ:

''انیسؔ و دبیرؔ کے بعد آنے والے مرثیہ گویوں میں واجد علی شاہ کو بحیثیت مرثیہ نگار کوئی مرتبہ نہ ملا۔''

ایسا نہیں ہے کہ واجد علی شاہ پر کتابیں نہیں لکھی گئی ہیں لیکن ان کتابوں میں ان کے علمی و ادبی کارناموں پر کم، انھیں بدنام کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے جہاں عبدالحلیم شرر کی جان عالم، واجد علی شاہ اور ان کا عہد (رئیس احمد جعفری) لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، لکھنؤ کا عوامی اسٹیج (سید مسعود حسن رضوی ادیب) سلطان عالم واجد علی شاہ (مسعود حسن رضوی ادیب) امجد علی شاہ (سید سبط محمد نقوی) اردو مرثیہ پاکستان میں (ضمیر اختر نقوی) واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات (کوکب قدر سجاد علی مرزا) اور واجد علی شاہ ان کی شاعری اور مرثیے (منظر حسین کاظمی) میں ان کی ادبی خدمات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ان میں سے دو مصنفین کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ واجد علی شاہ سے

ہے۔منظر حسین کاظمی ایک ایسے قلم کار ہیں جن کے دادا کو واجد علی شاہ نے دو مرثیے عطا کیے تھے اور وہ دربارِ واجدی سے وابستہ تھے۔کوکب قدر سجاد علی مرزا کا تعلق واجد علی شاہ کے خانوادے سے ہے اور انھوں نے واجد علی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات کے موضوع پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔اس کے علاوہ میر مونس حیات اور شاعری کے عنوان سے سید محسن رضا عابدی (امام جمعہ و جماعت ہوگلی مغربی بنگال) نے لکھنؤ یونیورسٹی سے تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس طرح مرثیہ تنقید کے حوالے سے یہ دو مقالے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

واجد علی شاہ نے مرثیہ تنقید کے لیے اپنے مرثیوں میں بہت سے مباحث وا کیے ہیں۔انھوں نے مرثیہ ناقدین کو دعوت دی۔توشۂ آخرت کا یہ شعر دیکھیں:

ہوں پختہ بیاں، ذکر میں ذرہ نہ ہو خامی
بے قاعدہ ہو نظم مسلسل سے نظامی

انھوں نے انیسؔ کی مرثیہ تنقید کی توسیع کی اور کہا:

اعجاز رقم خامۂ گل رنگ ہے میرا   ہاتھوں سے سوا حوصلۂ تنگ ہے میرا
میزاں ہے خرد، کوئی بھی پاسنگ ہے میرا   ہوں طائر سدرہ یہی آہنگ ہے میرا
اڈی ہے گھٹا فکر کی چرخ بدنی پر
یاقوت کی تحریر ہے ہیرے کی کنی پر
پنہائے مضامین سے رخ تنگ سمٹ جائیں   شمشیر تعمق سے سرفکر بھی کٹ جائیں
دل گردے بھی آواز خوش اتواپ سے پھٹ جائیں   روئے ورق ہفت فلک دم میں الٹ جائیں
مداح ہوں چودہ رخ زیبائے خدا کا
ہے تاج مرے سر پہ سر عرش ہدیٰ کا ۴۲؎

واجد علی شاہ کے مرثیے ایسے ہیں جنہیں آج بھی مرثیے کے حقیقی معنوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔انھوں نے اردو شاعری کے ایک گراں مایہ فن کو باقی رکھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مرثیے کو کلاسیکی رنگ اور فنی ادراک انیسؔ و دبیرؔ نے دیے تھے،انھیں واجد علی شاہ اخترؔ کے مرثیوں میں تلاش کرنا تو مشکل ہے جو خال خال ملیں گے لیکن ایک سچے فنکار کی حیثیت سے مرثیے میں بین کے حصے میں جو سوز اور تڑپ دے کر انھوں نے تخلیقی انداز میں توازن قائم کیا ہے،اس نے مرثیے کو سابقہ روایات کا حسین گلدستہ بنا دیا ہے۔جمیل جالبی،مسعود حسن رضوی ادیب، کوکب قدر سجاد علی مرزا اور ڈاکٹر منظر حسین کاظمی و ضمیر اختر نقوی سمیت ناقدین نے ان کے مرثیوں کی تعداد سو سے زیادہ بتائی ہے۔ عاشور کاظمی کی اطلاع کے مطابق ان کے گیارہ رثائی مجموعے اور دیوان مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔انھوں نے جہاں مرثیے کی تعداد سو سے اوپر بتائی ہے وہیں ان کی شاعرانہ خوبیوں کا تذکرہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے:

''سلطان عالم واجد علی شاہ اخترؔ نے ایک سو سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی مرثیے کہے ہوں گے۔واجد علی شاہ کے مرثیوں میں لکھنؤ کی ادبی فضا سامنے آجاتی ہے۔لفظوں کا تناسب، عالمانہ انداز بیان،سلاست وروانی،تشبیہات اور استعارات کی سجاوٹ سبھی کچھ تو ہے ان کے مرثیوں

ہیں۔ان کی حزنیہ اور بیانیہ شاعری میں ان کی قادرالکلامی واضح نظر آتی ہے۔''

اردو ادب میں مرثیہ کی اہمیت سے کوئی کیسے انکار کرسکتا ہے۔مرثیہ واجدعلی شاہ کے لیے توشۂ آخرت ہے۔اسی لیے ان کے مرثیے اپنے مزاج کے اعتبار سے مبکی اور بکائیہ ہیں۔جمیل جالبی نے ان کی ادبی خدمات کا کماحقہ محاکمہ کرنے کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔انھوں نے واجدعلی شاہ کو میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کا خوشہ چیں بتایا ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ:

''میر انیسؔ اپنے مراثی میں بین کی طرف مرثیے کو ارتقائی عمل سے گزار کر آتے ہیں۔اخترؔ اکثر بکا ہی سے شروع کرتے ہیں،وہ اپنے معاصرین انیسؔ و دبیرؔ کی خوشہ چینی کا بھی اعتراف کرتے ہیں:

مونسؔ انیسؔ سب کا ہوں میں خوشہ چینِ باغ ان کے کلام رکھتے ہیں ذاکر کے تر دماغ

اور دے دعا دبیرؔ سلامت رہیں سدا وہ کام کر کہ راضی ہوں دل بندِ مرتضیٰؑ

مونسؔ انیسؔ انسؔ سبھی شہریار ہوں جو ذاکرِ حسینؑ ہوں وہ تاجدار ہوں

مرثیہ تنقید میں مرثیے کے ڈرامائی عناصر پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے اور مسعود حسن رضوی ادیب،علی عباس حسینی،جعفر علی خاں اثرؔ،سید فضل امام رضوی،علی جواد زیدی اور نیر مسعود جیسے مرثیہ ناقدین نے اس پر بہت عالمانہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔مرثیے کی دنیا غزل کی دنیا سے الگ ہے۔غزلوں میں صرف ایک ہی جنس یعنی جنس مذکر اور وہ بھی جوانوں کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی رہی ہے لیکن مرثیوں میں ہمیں ہر جنس، ہر عمر اور ہر حیثیت کے افراد کی ترجمانی ملتی ہے۔واجدعلی شاہ کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کوکب قدر سجاد علی مرزا نے لکھا ہے کہ''ان کے مرثیوں میں فن موسیقی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔'' جمیل جالبی نے واجدعلی شاہ کے مختلف مراثی کے بندوں سے ثابت کیا ہے کہ اصطلاحات موسیقی اور مختلف راگ راگنیوں کے حوالے سے انھوں نے المیہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے مرثیوں میں راگ راگنیوں کو حسن ادا اور ربط و تسلسل کے ساتھ واقعہ کربلا کے موضوع سے ہم آہنگ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اخترؔ موسیقی کے ماہر تھے۔انھیں ہر راگ راگنی کے مزاج سے گہری واقفیت تھی اور اسی واقفیت سے غم والم کی ایسی فضا پیدا کی ہے، جو دوسرے مرثیہ گویوں کے ہاں نہیں ملتی،ساتھ ہی لفظوں کی ترتیب سے ایسا موسیقانہ آہنگ پیدا کیا ہے جو اس مرثیے کو پڑھتے وقت محسوس کیا جاسکتا ہے۔یہ روانی اور یہ آہنگ اخترؔ کے مرثیوں کی عام خصوصیت ہے۔''

واجدعلی شاہ کے مرثیے انیسؔ و دبیرؔ کو تو نہیں پہنچتے لیکن انھوں نے ان دونوں شعرا کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے ہم عصروں کی خوشہ چینی کرکے مرثیہ تنقید کے لیے مواد فراہم کیا۔واجدعلی شاہ کی مرثیہ نگاری بنگال کی قید و بند کی زندگی ہے جس نے بادشاہ کو توشۂ آخرت جمع کرنے کا زیادہ موقع دیا۔ایک طرف بنگال کی سرزمین سے نساخ انیس کی تنقید کررہے ہیں تو دوسری طرف واجدعلی شاہ اپنے کلام کے ذریعہ انیسؔ، دبیرؔ،مونسؔ،انسؔ جیسے مرثیہ نگاروں کے مداح ہیں۔بنگال کے ناقدین اگر چاہتے تو مرثیہ تنقید کے لیے،بہت سا مواد تھا جس پر وہ تنقید کی راہ پر چل پڑتے لیکن بنگال کے شعرا نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی پر توجہ تو دی لیکن مرثیہ تنقید قحط کا شکار رہی۔بعد میں مسعود حسن رضوی ادیب اور منظر حسین کاظمی نے واجدعلی شاہ کے مرثیوں پر ناقدانہ نظر ڈالی اور واجدعلی شاہ کو بھی مرثیہ تنقید میں بھی جگہ ملی۔

بنگال کے قلم کاروں میں کوکب قدر سجاد علی میرزا نے جہاں انتخاب واجدعلی شاہ کے علاوہ''واجدعلی شاہ کی ادبی وثقافتی خدمات'' کے عنوان سے تحقیق مقالہ پیش کیا وہیں دیگر قلم کاروں نے انیس پر مضامین لکھ کر مرثیہ تنقید کے کارواں کو آگے بڑھایا۔ساتھ ہی''میر مونسؔ حیات اور

شاعری'' کے عنوان سے سید محسن رضا عابدی نے لکھنؤ یونیورسٹی سے تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کرکے واجد علی شاہ کی تنقیدی روش کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ ڈاکٹر جاوید نہال کی کتاب ''تحقیق اور تنقید'' میں ایک مضمون ''میر انیسؔ کی رزمیہ شاعری'' کے عنوان سے ہے لیکن وہ مضمون راقم کے مطالعے میں نہیں آیا ہے لیکن مرثیہ تنقید میں بنگال میں ایک اہم نام پروفیسر اعزاز افضل کا ہے، جنھوں نے انیسؔ اور مرثیہ کے حوالے سے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ انھوں نے ''واقعات کربلا اور اردو ادب میں'' مرثیہ نگاری کی عظمت، اس کی فنی قدروں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''لطیف جذبے جو غزلوں میں مفقود ہو چکے تھے، ایک بار پھر انگڑائی لینے لگے۔ غرض مرثیوں نے مذہبی طور پر اخلاقی درستگی، اعمال کی استواری، ایمان کی پختگی اور روح کی بالیدگی میں جتنا حصہ لیا ہے، ہماری زبان، ہمارے ادب اور ہماری تہذیب کو سنوارنے اور نکھارنے میں بھی اتنا ہی معاون ثابت ہوا ہے۔''

واجد علی شاہ اخترؔ نے مٹیا برج کولکاتہ میں جس عزائی ادبی فضا کو رائج و مستحکم کیا تھا اُسے نظم طباطبائی، آرزوؔ لکھنوی اور وحشتؔ کلکتوی نے پروان چڑھایا اور بعد میں وحشت کی تربیت سے جمیلؔ مظہری جیسا مفکر، فلسفی اور صاحب طرز شاعر پیدا ہوا جس نے بنگال کے ادبی جمود کو توڑا۔ جمیلؔ مظہری نے جہاں وحشت کی علمی صحبتوں سے استفادہ کیا وہیں انیس، نفیس اور اوج کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرکے مرثیہ تنقید کا حصہ بھی بنے:

تخییل اوجؔ کی ہو ، بلاغت نفیسؔ کی
تلچھٹ مجھے بھی چاہیے ، جامِ انیسؔ کی

راقم الحروف نے اپنے مضمون ''اکیسویں صدی میں بنگال کا رثائی ادب'' میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وحشتؔ کلکتوی اور آرزوؔ لکھنوی جیسے اساتذہ کی صحبتوں نے بنگال میں جہاں جملہ اصناف سخن کی آبیاری کی، وہیں ان کی تربیت سے رثائی ادب میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔''

جمیلؔ مظہری نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ ''استاد موصوف کی براہ راست شاگردی سے زیادہ ان کی اس صحبت سے فنی اور ادبی فیوض حاصل کیے۔'' جمیلؔ مظہری کے اس اعتراف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ استادی اور شاگردی کا یہ تعلق اتنا اہم نہیں تھا جتنا تعلق وحشتؔ کلکتوی کی علمی و فکری صحبتوں سے استفادے کا تھا۔ ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے لکھا ہے کہ ''وحشتؔ کلکتوی کی زندگی، حالات اور ان کے شعری و ادبی کارناموں پر مشتمل مضامین و مقالوں میں صنف مرثیہ کے ذیل میں ان کی کسی بھی کاوش کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا البتہ وفا راشدی نے 'حیات وحشتؔ' میں اس کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا جب تک کلکتے میں رہے، آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے ان کی تقریریں، نظمیں اور غزلیں برابر نشر ہوتی رہتی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں ہجرت کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی لیکن ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کے بے حد اصرار پر دوبارہ اس تعلق کی تجدید ہوئی۔ پہلا پروگرام ۱۱؍اکتوبر ۱۹۵۰ء کو نشر ہوا جس میں انھوں نے واقعہ کربلا سے متعلق ایک نہایت موثر مرثیہ پڑھا۔ اس مرثیے کے دو بند یہ ہیں:

بیعت کریں حسینؑ یہ حکمِ یزید تھا ۔ یہ حکم جب شہنشاہِ دارین نے سنا
فرمایا ہم یزید کا مانیں گے حکم کیا ۔ مالک خدا ہے اور ہیں ہم بندۂ خدا
حکم خدا ہے حق کی حمایت کریں گے ہم
ایذا سہیں گے پر نہ شکایت کریں گے ہم

باطل کو حق نہ مانیں گے ، ابنِ علیؑ ہیں ہم کیا چھوڑیں سیدھی راہ کہ سبطِ نبی ہیں ہم
کفّار سے ڈریں گے بھلا ہاشمی ہیں ہم کیونکر نہ چمکیں دین کی جب روشنی ہیں ہم
روشن کریں گے جلوۂ حق سے جہان کو
ارفع کریں گے دینِ محمدؐ کی شان کو

وحشتؔ پر تحقیقی مقالہ لکھنے والے ڈاکٹر سید علی عرفان نقوی نے بھی وحشت کی مرثیہ نگاری یا مرثیہ تنقید پر کوئی گفتگو نہیں کی ہے لیکن اپنے فیس بک چینل 'مغربی بنگال کا رثائی ادب' میں وحشتؔ کلکتوی کے مرثیے کے آٹھ بند نقل کیے ہیں لیکن اس پر کوئی ناقدانہ نظر نہیں ڈالی ہے۔ وحشتؔ کو غالبؔ ثانی کہا جاتا ہے ان کے یہاں فکر کی جو گیرائی و گہرائی ہے، الفاظ کا دروبست اور رنگ و آہنگ کی جو انفرادیت ہے ان کے ہم عصر آرزوؔ لکھنوی اور ناطقؔ لکھنوی جیسے اساتذۂ فن کے یہاں نہیں ہے۔ وحشتؔ کے حلقۂ تلامذہ میں جمیلؔ مظہری جیسے جدت پسند شاعر بھی تھے جنھوں نے وحشتؔ کی طرح روایتی ورسمی شاعری سے پرے اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے لکھا ہے:

''خاندان کے عزائیہ ذوق اور شعور مرثیہ گوئی سے شروع ہو کر مطالعہ تاریخ اور پھر وحشتؔ کلکتوی، ابوالکلام آزادؔ، اقبالؔ اور غالبؔ کے فکری دھاروں تک پہنچنے والا یہ سفر، جمیلؔ مظہری کی مرثیہ گوئی کے پس منظر میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔''

جمیلؔ مظہری کی زندگی کا ایک خاص حصہ بہار میں گزرا، لیکن ان کی شاعری کو بنگال نے نکھارا۔ غالبؔ اور اقبال کی فکر کا تو پر نہ صرف یہ کہ ان کی شعریات پر بلکہ مرثیوں پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ جمیلؔ کے ہم عصروں میں جوشؔ کا نام جدید مرثیہ میں سب سے اوپر ہے جمیلؔ کے ابتدائی تین مرثیوں میں جن کی تصنیف بنگال میں ہوئی اس میں جہاں غالب کا طرز نمایاں ہے وہیں جوشؔ کے لہجے کی گونج بھی سنی جاسکتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''جمیل مظہری نے مرثیے میں بعض ندرتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک طرح سے جوشؔ ملیح آبادی کے طرز مرثیہ گوئی میں نیا رنگ بھرا ہے۔''

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی، ڈاکٹر ثریا جمیل، ڈاکٹر فضل امام رضوی، پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر ای اے حیدری سمیت اردو مرثیے کے ناقدین نے جمیل کی مرثیہ نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے لیکن بنگال میں جمیلؔ کی نظم گوئی، صحافت اور غزل کے حوالے سے کام تو ہوا ہے لیکن مرثیہ تنقید میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اعزاز افضل جیسے رثائی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ادیب نے بھی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ اشرف احمد جعفری نے بھی صرف فہرست سے کام چلایا ہے۔ ہمایوں جمیلؔ نے ''جمیلؔ مظہری حیات اور ادبی جہات'' میں صرف چار صفحات 'مرثیہ نگاری' کے عنوان سے مختص کیے ہیں لیکن اس میں مرثیہ تنقید کے حوالے سے گفتگو نہ ہو کر صرف رسمی طور پر ان کی مرثیہ نگاری کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''انھوں نے مرثیہ نگاری پر پوری توجہ نہیں دی جتنی انھیں دینی چاہیے تھے لیکن جس حد تک انھوں نے کوشش کی ہے اس میں ان کو کامیابی ضرور ملی ہے۔'' ہمایوں جمیل کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جمیلؔ کے مراثی کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا ہے جب کہ سچائی یہ ہے کہ جمیل نے جدید مرثیہ میں جہاں فلسفہ کا خوبصورت استعمال کیا، ہیئت میں بھی اپنے اجتہاد سے قارئین مرثیہ کو چونکایا اور جس کی تقلید جدید مرثیے کے دو بڑے شاعر اور ناقد ڈاکٹر وحید اختر اور ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے کی۔

ڈاکٹر ای اے حیدری نے اپنے تحقیقی مقالہ ''ہندوستان میں جدید اردو مرثیہ کا ارتقا'' میں جمیلؔ مظہری کی مرثیہ نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اصلاحی موضوعات کو بھی رثائیت کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیتے۔انہیں اصلاحی پہلو کے علاوہ بھی یہ مرثیے اس اعتبار سے فوری طور پر ہماری توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں کہ ان میں جمیلؔ مظہری نے سودا کے عہد سے چلی آرہی مرثیہ کی ہیئت مسدس کے تیسرے مصرعے کو غیر مقید کر کے تبدیلی کی۔'' انھوں نے آخر میں جمیلؔ مظہری کی مرثیہ نگاری کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا:

''جمیل مظہری اس دور کے واحد مرثیہ گو ہیں جنھوں نے ہیئت کے میدان میں پہلی بار عملی اقدام کیا۔جمیلؔ مظہری مسدس کی تاثیر اور اس کی قوت سے پوری طرح واقف تھے۔اس لیے انھوں نے مرثیے کی ہیئت کے لیے مسدس کی فارم سے کلی طور پر انحراف نہیں کیا۔صرف اس کے تیسرے مصرعے کو غیر مقید کر کے مسدس کی ہیئت میں ایک نیا تجربہ پیش کرنے کی کوشش کی۔''

جمیلؔ مظہری کے بعد بنگال میں پروفیسر اعزاز افضل رثائی شاعری کا معتبر نام ہے۔انھوں نے رثائی شاعری بھی کی اور مرثیہ تنقید بھی لکھی۔نعیم انیس لکھتے ہیں کہ:

''اعزاز افضل کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رثائی کلام کے ذریعہ اپنی آزاد فکر اور نظریہ کا برملا اظہار کیا ہے۔''

اصغر انیس کو اعزاز افضل کے رثائی کلام میں مظلوموں کا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ رثائی ادب کے تذکرے کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ ادھوری اور نامکمل مانی جائے گی۔اصغر انیس کو بنگال میں مرثیہ تنقید کی کمزوری کا احساس ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''مروجہ صورتِ حال کے تحت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ بزرگان زبان و ادب نئی نسل کو رثائی کلام کی جانب بھی مائل کریں تا کہ رثائی میدان میں برسوں سے چلی آرہی کمی کا ازالہ ہو سکے۔''

لیکن اس اعتراف کے باوجود وہ اعزاز افضل کی مرثیہ تنقید میں کوششوں کو سراہتے بھی نظر آتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''یہی وہ مقام ہے جہاں اعزاز افضل اپنے معاصر قلم کاروں پر سبقت لے جاتے نظر آتے ہیں۔''

اصغر انیس بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہیں۔اس کے باوجود وہ رثائی ادب پر مستقل لکھتے رہتے ہیں۔مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتہ اور خضر پور کالج کولکاتہ کے اشتراک سے منعقدہ قومی سمینار ''مغربی بنگال کا رثائی ادب'' میں انھوں نے ''مرشد آباد کا رثائی ادب'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تو اس میں اردو ڈرامہ نگاری میں مرثیے کے رول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''اردو پر اسلامی اثر نے ڈرامے کو کبھی فروغ پانے نہیں دیا تھا۔مرثیوں کے اثر سے ہمیں ڈائیلاگ،ایکشن اور پلاٹ جیسے ڈرامائی عنصر میسر ہوئے جو آگے چل کر ہمارے ڈرامہ نگاروں کے لیے معاون ثابت ہوئے۔غزلوں نے ہماری زبان کو مانجھا ضرور تھا لیکن اسے صرف مجلسوں او رمشاعروں تک محدود کر دیا تھا۔مرثیوں کے ذریعہ وہ بے شمار جنگی اصطلاحیں اور الفاظ جنہیں ہم غیر مہذب،نامناسب اور غیر ادبی کہہ کر جلاوطن کر چکے تھے،اسے مہذب،موزوں،مناسب اور مودب بن کر ہماری مجلسوں میں داخل ہوئے جس کا پہچاننا مشکل ہو گیا۔''

اصغر انیس نے مذکورہ مضمون میں آزادی سے لے کر موجودہ عہد تک کے مرشد آباد کے رثائی کلام کہنے والے شعرا کے کلام کو پیش کرتے ہوئے مرثیہ تنقید کی موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آزادی کے بعد مرشد آباد میں متعدد شعرائے کرام نے رثائی کلام ضرور کہے ہیں۔ان کے کلام سے سوز،سلام،نوحہ،ماتم کے حوالے سے رثائی ادب کی تاریخ کے خزانے میں بے حد اضافہ ہوا ہے ساتھ ہی ساتھ قصیدہ اور منقبت گوئی میں بھی اضافہ ہوا ہے لیکن اس دوران

مرثیہ نگاری کے میدان میں تشفی بخش پیش رفت نہیں ہوئی،محض چندہی ایسے شعرا ہیں جو مرثیہ نگاری کی جانب مائل ہوئے۔''

اس سلسلے میں انھوں نے مرشدآباد میں مرثیہ نگاری کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ہر چند کہ ماضی میں مرثیہ نگاری غیر تشفی بخش اور مایوس کن حالات وکیفیت کا شکار رہی تاہم ۲۱ ویں صدی میں حالات کچھ بدلے سے نظر آتے ہیں۔حالیہ دنوں میں مرشدآباد کے چند نوجوان شعرا نے مرثیہ نگاری کی جانب پیش قدمی کی ہے۔مرثیہ گوئی کی جانب ان کے بڑھتے ہوئے رجحان سے رثائی ادب میں ترقی کے آثار روشن نظر آتے ہیں۔''

اصغر انیس کے متذکرہ مضمون میں اور راقم الحروف نے اپنے مضمون ''اکیسویں صدی میں بنگال کا رثائی ادب'' میں مرشدآباد، مٹیابرج اور بنگال کے دوسرے شعراء کے مراثی کے متعدد نمونے پیش کر دیے ہیں۔اس وقت بھی مرشدآباد سے اطہر آفاق اطہرؔ، امجد حسین رونقؔ، سید ہاشم بہادر ہاشمؔ اور مولانا صادقؔ رضوی مرثیے کہہ رہے ہیں۔وہیں مٹیابرج اور کولکاتہ کے دوسرے علاقوں سے شمیم مٹیابر جی، علی نظر وسیم، شیراز حسن شیرازؔ، پرویزؔ بلیاوی، سید فدا حسین، راقمؔ لکھنوی، سید اصغر حسین رضوی، عرشیؔ نقوی، مولانا احسنؔ نقوی، سید ناظم رضاؔ کے رثائی کلام بنگال کے ناقدین کو مرثیہ تنقید پر لکھنے کی دعوت دے رہے ہیں کہ اس مظلوم صنف ادب کا بھی فنکارانہ جائزہ لیا جائے۔بنگال کی ادبی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بنگال کے ادب نواز مرثیہ تنقید میں بھی ابتدا ہی شامل رہے ہیں، چاہے وہ عزلت علی، قلی ندیم، انشاء وناسخ کی شکل میں یا بعد میں کوکب قدر سجاد علی مرزا، محسن رضا عابدی، اعزاز افضل واصغر انیس کی شکل میں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ بنگال کے قدیم وجدید مراثی پر سنجیدگی سے کام کیا جائے اور ان شعراء کے کلام کا فنی محاسبہ کر کے بنگال کی مرثیہ تنقید کو اردو تنقید میں جائز مقام دلایا جا سکے۔مرثیہ تنقید نے اب اپنے قدم کو سماجیات، نفسیات، اسلوبیات اور جمالیات کی طرف قدم بڑھا دیے ہیں۔گوپی چند نارنگ اور منظر عباس نقوی نے جہاں اسلوبیات کے حوالے سے کام کیا ہے وہیں پروفیسر عقیل رضوی نے ''مرثیے کی سماجیات'' لکھ کر اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''مرثیے کی جمالیات'' اور راقم الحروف نے ''اردو مرثیے کی جمالیات'' کے ذریعہ مرثیے کی آفاقیت اور اس کی نئی صدی میں قدر وقیمت کے تعین کی کوشش کی ہے۔راقم الحروف اس مقالے کو اپنے ہی جملوں سے ختم کرتے ہوئے بنگال کے ناقدین کو دعوت دیتا ہے کہ مرثیے کے اس پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور کریں۔رثائی ادب کے ساتھ ساتھ رثائی تنقید میں بھی بنگال کے پرچم کو بلند کریں۔

''شاعری کی جمالیات نئی صدی کا وہ موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔حسن اور حسن کی فسوں کاری ہر زمانے اور ہر عہد کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اور بیشتر لوگوں نے ہوس کاری اور عریانیت کو جمالیات کا حصہ بنا دیا ہے۔مرثیہ کی جمالیات تزکیۂ نفس اور کردار سازی کے اس میزان سے چھن کر آتی ہے جو ہمیں عبد ومعبود کے رشتے کی مضبوط رسی سے جوڑ دیتی ہے۔اس جمالیات میں کہیں عبد ومعبود کے رشتہ کی ہمہ گیری اور وسعت میں عاشق ومعشوق کی ناز برداری ہے تو کہیں معبود کی تخلیق کردہ مناظر فطرت اور مناظر قدرت کی رنگینی۔اس جمالیات کی پیشکش میں مرثیہ نگاروں نے جو کردار پیش کیے ہیں وہ اللہ جمیل ویحب الجمال'' کی معنوی رفعتوں کا پتہ دیتے ہیں۔''

❁❁❁❁

غدیر

عارفؔ کاظمی

تکمیلِ دیں کی بات ہے، ہاں لِکھ "غدیر" لِکھ
بابِ سخن کے باب میں عہدِ ضمیر لِکھ

قرآں کی آیتوں سے اگر درک ہے تجھے
آیاتِ ایزدی سے صفات امیرؑ لِکھ

حیدرؑ کی منقبت ہے ، نگاہیں جھکی رہیں
قرطاسِ جاں پہ خامہ دل کی صریر لِکھ

راکب رسولِ حق کا ، دل و جانِ مُرتضیٰؑ
اوصاف میں حسینؑ کے تطہیرِ شِیر لِکھ

شیرِ خدا کے شیر کے رُخ پر نگاہ کر
ابرو کو لِکھ کمان تو نظروں کو تیر لِکھ

دار و رَسن کو نسبتِ میثمؒ سے یاد کر
اور کربلا کے بعد شہیدِ کبیر لِکھ

امّ اُلبنیں کے شیر، علیؑ کے دلیر کو
میدانِ کربلا میں علیؑ کی نظیر لِکھ

مشکل سے قبل دیکھ علیؑ کو پکار کر
اِس ناصرِ رسولؐ کو پھر دستگیر لِکھ

جور و جفا ہے ظُلم و تشدّد جہان میں
تاریکیوں کی بھیڑ میں ذکرِ مُنیر لِکھ
حق نے وِلا کو دین کا محور بنا دیا
لفظِ وِلا کو ناز سے لفظِ اخیر لِکھ
اب قافیہ میں ایک غلامی کی شرط ہے
مقطع میں اپنے آپ کو عارفؔ فقیر لِکھ

چھنّو لال دلگیر (غلام حسین دلگیرؔ)

اصغر مہدی اشعر

نیکی اور بدی ہمیشہ سے معرکہ آرا رہے ہیں، یہ معرکہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک یہ جنگ جاری رہے گی۔ کبھی ہابیل کے مقابلے میں قابیل نظر آئے گا تو کبھی موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون اپنی طاقت دکھلاتا نظر آئے گا، کبھی ابراہیم نمرود کے ظلم کی بدولت آگ میں پھینکے جائیں گے تو کبھی رسولِ خداؐ کے جوتے طائف کے بچوں کے ہاتھوں خود ان کے خون میں بھرے نظر آئیں گے۔

جب ہم مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک قدر مشترک جو ہمیں نظر آتی ہے وہ حق کی طرف داری اور باطل سے بے زاری ہے۔ مذاہبِ عالم میں ایک قدر مشترک انسانیت ہے، یہ کہنا بجا ہوگا کہ مذہبِ انسانیت مختلف مذاہب کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ رسم و رواج، عادات و اطوار، رنگ ڈھنگ چاہے مختلف کیوں ہی نہ ہوں انسانی فطرت حق پرستی کی طرف رغبت اور باطل سے بیزاری اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حق پرستی اور انسانیت کا مزاج ایک ہے، یہ وہ مزاج ہے جس کا میزان ہر مذہب نے بیان کیا ہے۔ اور انسانیت اور حق پرستی کو ایک کسوٹی بتلایا ہے جس کا معیار جس کا میزان خود ضمیر انسانی ہے جو حق، سچ اور مثبتیت کی طرف راغب ہے اور جسے برائی، جھوٹ، ظلم، منفیت سے بیزاری ہے۔

عموماً حق اور باطل کے معرکے میں ایک جانب فتح کے نقارے بجائے جاتے ہیں اور دوسری جانب شکست کا زخم چاٹا جاتا ہے مگر جب کبھی شکست کو فتح اور فتح کو شکست سے دوچار ہونا پڑے تو نفس انسانی اس کی تفصیلات کو اپنے دل کے قریب پاتا ہے، ان تفصیلات اور اس ذکر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ یہ وہ ذکر ہے جس کا میزان جس کی کسوٹی کوئی مذہب نہیں کوئی رنگ نہیں کوئی رسم نہیں کوئی قوم نہیں کوئی قبیلہ نہیں کوئی خاندان نہیں، یہ ذکر ذکر ہے حق کی بلندی کا، انسانیت کے عزم کا، سچ کے کردار کا، ہار کے جیت جانے کا، جان دے کر زندگی پانے کا، زندگی بھی ایسی زندگی کہ جو تا بہ ابد حیات۔ ایسے اذکار و واقعات جب مختلف مذاہب کے عوام الناس تک پہنچتے ہیں تو حق کی سربلندی کا باعث ہوتے ہیں اور ضمیر انسانی ان حالات واقعات کو سن کر وہ معیار پیش کرتے ہے جہاں میزانِ عقل، میزانِ عدل اور میزانِ انسانیت حق پرستی، سچائی، مظلومیت، مثبتیت، عزم، ہمت اور کردار کو "حسینیتؑ" کے نام سے پہچانتا ہے اور برائی، ظلم، شیطنت، حق تلفی، بزدلی، منفیت اور بدکرداری کو یزیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہر زبان کا ادب ان واقعات و اذکار سے مزین ہوتا ہے۔ یہ واقعات نسلوں کی تربیت کرتے ہیں اور ماؤں کی گود سے مدارس اور یونی ورسٹیوں تک قوم کے کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو ادب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جس نے حزن، ملال، عزم اور استقامت، حق پرستی، تعمیرِ قوم سے بھرپور ایک ایسی

صنفِ سخن ہمیں عطا کی جسے مرثیہ کہا جاتا ہے۔

مرثیہ جو کہ لفظِ رثا سے مشتق ہے عموماً اس کا مطلب مردے کے اوصاف بیان کرنے کو لیا جاتا ہے پچھلے چودہ سو سالوں میں یہ مرثیے ان ہی اذکار و واقعات سے پر ہیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ یہ مرثیے جنگِ کربلا کے واقعات بیان کرتے ہیں، یہ وہ جنگ ہے جو آج بھی حق و باطل کے درمیان ایک معیار ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جو حق پرستی، انسانیت، عزم و استقلال کی بنیاد پر لڑی گئی، یہ وہ جنگ ہے کہ جس میں ظاہری طور پر شکست پانے والا ابد تک فاتح قرار پایا۔ یہ وہ جنگ ہے جہاں مرنے والا حیاتِ ابدی سے سرفراز ہوا اور مارے جانے والا ابدی موت کا سزاوار ہوا۔ یہ وہ جنگ ہے جس نے صرف اسلام کو دوبارہ زندگی نہیں دی، انسانیت کے چراغ کو دوبارہ روشن کیا، یہ وہ جنگ ہے جہاں کمزوری نے طاقت کو پچھاڑ ڈالا، یہ وہ جنگ ہے کہ جس میں خنجر کی تیز دھار پر رگِ گردن نے غلبہ حاصل کیا۔ یہ تذکرہ ہے جنگِ کربلا کا جس میں نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؑ نے اپنے اعزا و اقربا کے ساتھ وہ قربانی پیش کی جس پر آج تلک عقل انسانی حیران ہے۔

جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا سکھا دیا تو نے

زندگی کی تفاصیل بیان کرنے کے واسطے خود نوشت لکھی جاتی ہیں مگر موت، موت کی تفصیل بیان ہو تو کیسے ہو۔ یہ مسئلہ رثائی ادب نے حل کیا اور پچھلے پانچ سو سال سے زیادہ کے عرصے میں مرثیوں کے طفیل اُس موت کی تفصیل بیان کی جس نے تمام عالم کو زندہ کر دیا۔ ان تفاصیل کو بیان کرنے میں صرف ایک مذہب کے لوگ شامل نہ تھے صرف ایک قوم کے افراد شامل نہ تھے، صرف قبیلہ نہ تھا، صرف ایک رنگ نہ تھا بلکہ دنیائے ادب کے ہر مذہب اور نسل کے افراد نے اس آوازِ حق پر لبیک کہا، ھل من ناصر کی صدائے استغاثہ کا جواب دیا اور پچھلے پانچ سو سالہ اردو مرثیے کی تاریخ میں قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، ہاشم، سودا، میر اور سکندر سے لے کر آج تک مرثیے کا ایک ایسا بحرِ بے کراں تشکیل دیا جس نے حق پرستی کے احساسات کی پیاس کو تا ابد تک سیراب کر دیا ہے۔

عرب اور فارس سے سفر کرتا ہوا اردو ادب کا یہ سفینہ، مرثیے کا یہ کارواں ہندوستان میں آتا ہے تو مختلف مذاہب کے ماننے والوں بالخصوص ہندو شعرا نے حق پرستی کا یہ علم اپنے ہاتھوں میں اٹھایا، ان شاعروں میں سرفہرست چھنّو لال دلگیرؔ ہیں۔

تعارف

شیفتہ گلشنِ بے خار میں دلگیر کا نام جھنّو لال کائستھ لکھتے ہیں، لکھنؤ کی رہائش، جب کہ استاد کا نام نوازشؔ حسین نوازش بتلاتے ہیں، طربؔ تخلص لکھتے ہیں اور مرثیے کی نسبت سے تخلّص دلگیرؔ لکھتے ہیں، ساتھ میں یہ تذکرہ بھی کہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر شرف بہ اسلام ہوئے اور ان کے مرثیے زبان زدِ عام ہیں۔

سراپا سخن صفحہ نمبر ۱۱۵ پر محسن علی موسوی صاحب نے میاں دلگیرؔ کے ساتھ چھنگو لال نام لکھا ہے اور ساتھ میں ان کی قوم کایتھ سکسینہ بتلائی ہے۔ محسن صاحب لکھتے ہیں کہ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد میاں دلگیرؔ نے اپنا کلام موتی جھیل میں ڈبو دیا۔ سراپا سخن میں ناسخؔ کو بھی میاں دلگیرؔ کا استاد کہا گیا ہے۔

ریاض الفصحاء کے صفحہ ۱۸۸ پر مصحفیؔ چھنولال کو طربؔ کے تخلّص سے تعارف کراتے ہیں اور بزرگوں کا وطن شمس آباد تحریر کرتے ہیں۔
اردو ادب کے قارئین ڈاکٹر اسپرنگر سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر اودھ کے ڈپٹی کمشنر تھے اور اس زمانے میں آپ نے شاہانِ اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کی تھی جسے یادگارِ شعرا کہا جاتا ہے۔ یادگارِ شعرا صفحہ ۱۳۱ پر دلگیر کا تعارف یوں کراتے ہیں۔
چھنّولال کائستھ لکھنوی، شاگرد نوازش یہ زیادہ تر مرثیے کہتے ہیں اور ان میں مختلف تخلص کیا کرتے ہیں۔ اسلام قبول کرلیا ہے (گلشنِ بے خار)۔ بعد میں امام بخش ناسخؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ اب اودھ کے دربار میں ہیں (طبقاتِ سخن) جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، گلشنِ بے خار اور ریاض الفصحاء دونوں میں چھنّولال دلگیر کا تخلص طربؔ اور ان کی شناخت طربؔ کے طور پر کی گئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ دلگیرؔ مرثیوں کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے بیشتر غزل کہتے تھے۔
دلگیرؔ کے نام کرکی گئی تحقیق پر محققین مصحفیؔ کی ریاض الفصحا کو ترجیح دیتے ہیں اور چھنّولال کو رسم کتابت کا فرق جانتے ہیں۔ پروفیسر اکبر حیدری نے بھی قدامت کے لحاظ سے مصحفیؔ کی ریاض الفصحا کو فوقیت دی ہے۔ مصحفیؔ کی تائید میں مبتلا و عشق میرٹھی بھی طبقاتِ سخن میں چھنّولال ہی لکھتے ہیں۔
پروفیسر اکبر حیدری نے دلگیر کا سنِ پیدائش ۱۱۹۵ ہجری بمطابق ۱۷۸۰ھ بتلایا جب کہ مسیح الزماں صاحب کے مطابق دلگیرؔ کا سنِ پیدائش د ۱۱۹۸ ہجری بمطابق ۱۷۸۳ عیسوی ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی تحقیق کو اس وجہ سے فوقیت حاصل ہے چونکہ انہوں نے ساتھ میں یہ دلیل تحریر کی ہے کہ ۱۲۵۵ ہجری میں دلگیر نے حسین آباد کے بازار کی تعریف میں جو مثنوی لکھی اس کے آخر میں یہ قطعہ تحریر کیا۔

شہید ایک شیخ ناسخ کا ہے شاگرد
دعائے شاہ ہے اس کا صدا ورد
سدا میری طرف محوِ دعا ہے
ہمیشہ نام حضرت پہ فدا ہے
مجھے یہ مثنوی کہتے تو دیکھا
خوشی اس کی ہوئی حد سے زیادہ
تامل کرکے کچھ پھر، ہو کے خورم
کہا میں نے کہی تاریخ اس دم
لکھا یہ مصرعِ تاریخ یکبار
صفات شاہؒ میں ہے مدحِ بازار

(۱۲۵۵ہجری)

امجد حسین صاحب کے مطابق جو غیر مسلم مرثیہ نگار نامی کتاب کے مصنف بھی ہیں اپنی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر تحریر کرتے ہیں کہ محمد علی شاہ بادشاہ اس مثنوی پر بہت خوش ہوئے اور چار سو روپے انعام اور خلعت عطا کیا۔

دلگیرؔ کے والد مصحفیؔ کی ریاض الفصحا کے مطابق، منشی رسوارام تھے اور قوم کائستھ سکسینہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بزرگوں کا وطن مصحفیؔ نے شمس آباد لکھا ہے اور دلگیرؔ کی ولادت اور تعلیم و تربیت لکھنؤ میں بتلائی ہے۔

شاعری کی ابتدا اور اساتذہ

مصحفیؔ کے مطابق چھنو لال دلگیرؔ کی طبیعت کم عمری میں ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی اور سترہ سال کے سن سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ نوازش حسین، جنھیں مرزا خانی بھی کہا جاتا تھا، کی شاگردی اختیار کی۔ نوازشؔ میر سوزؔ کے شاگرد تھے اور مصحفیؔ نے انہیں قومِ مغل کا بتلایا ہے اور ان کے دو تصنیف کردہ دیوان کا تذکرہ کیا ہے۔ نوازشؔ صاحب کی تربیت نے اپنا اثر دکھلایا اور مصحفیؔ کے مطابق ۲۳ سال کی عمر میں دلگیرؔ کا شمار ممتاز شعرا میں شمار ہونے لگا۔ ریاض الفصحا میں یہ بھی تحریر ہے کہ بزرگوں کی فیضِ صحبت سے کلام میں ایسی پختگی آئی تھی کہ اپنے استاد کے ہم پلّہ ہونے لگے۔

خوش معرکہ زیبا کے مطابق جب نوازش حسین مرزا خانی نے کان پور کی سکونت اختیار کی تو دلگیرؔ نے اپنے استاد کے کہنے پر ناسخؔ کی شاگردی اختیار کی۔ یہ وہی ناسخؔ ہیں جنہوں نے انیسؔ کا تخلّص حزیں سے بدل کر انیسؔ کر دیا تھا۔

تبدیلیٔ مذہب

راقم خوش معرکۂ زیبا کے مطابق دلگیرؔ عمرِ شباب میں بڑے رند منش اور رنگین مزاج تھے چنانچہ اس لاؤ بالی کے عالم میں مذہبِ اسلام اختیار کیا اور غزل گوئی کی جگہ مرثیہ کہنا شروع کیا۔

ناچیز اس سے قطعی متفق نہیں اور مسیح الزماں صاحب کی تحقیق کی جانب زیادہ جھکاؤ رکھتا ہے جو شیفتہؔ کی تحقیق کے مطابق ہے۔ شیفتہؔ نے دلگیرؔ کے مذہب تبدیل کرنے کی وجہ آئمہ و اہلِ بیتؑ کی محبت بتلایا ہے، ان سے عقیدت بتلایا ہے۔ مرثیہ نگاری کی طرف رغبت لاؤ بالی پن نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ خاص عقیدت اور محبت پر مبنی ہے۔ آپ شہادت کے اوصاف، فضائل اور مصائب بغیر عقیدت کے بیان کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے نزدیک آئمۂ اہلِ بیت کی محبت نے دلگیرؔ کا دل پلٹ دیا اور انہوں نے مذہبِ اسلام اختیار کرنے کے علاوہ ایک مسجد و امام باڑے کی بنیاد بھی ڈالی اور اپنی زندگی خدماتِ آلِ رسولؐ میں وقف کر دی۔ چونکہ اس وقت ہم دلگیرؔ کے حالاتِ زندگی بیان کر رہے ہیں اور مرثیہ نگاری کی خصوصیات موضوع نہیں لہٰذا تفصیل میں جائے بغیر یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دلگیرؔ کے مرثیے خود اس کی دلیل ہیں کہ ان کے مذہبِ اسلام اختیار کرنے کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔

یا شاہؑ مری فردِ عمل اشکوں سے دھو جائے
انجام بخیر آپ کے دلگیرؔ کا ہوجائے

یہ عقیدت و محبت ہی تو تھی کہ محسنؔ لکھنوی صاحب کے مطابق اپنا غزلیہ کلام موتی جھیل لکھنؤ میں ڈبو دیا اور صرف مرثیۂ معصومینؑ پر ہی اکتفا کیا۔ وہی مرثیہ جس نے دلگیرؔ کو آج تک زندہ رکھا ہے۔

دلگیرؔ کی تبدیلیٔ مذہب کی بحث دل چسپ ہے، اردو مرثیے کا ارتقا صفحہ نمبر ۲۷۷ پر مسیح الزماں صاحب لکھتے ہیں۔

''لیکن یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے رسمی طور پر با قاعدہ تبدیلیٔ مذہب کیا تھا یا صرف رہن سہن کے انداز وخیالات کی بنیا پر لوگوں نے قیاساً لکھ دیا ہے کیونکہ با قاعدہ مذہب تبدیل کرنے میں عموماً نیا نام بھی رکھا جاتا ہے جس کا اظہار بھی کیا جاتا ہے لیکن دلگیرؔ کے کسی معاصر یا بعد کے تذکرہ نویس نے کہیں ان کے کسی نئے نام کا ذکر نہیں کیا۔''

یہ تحقیق ادھوری رہ جاتی اور یہ رائے مقدم ہو جاتی اگر اکبر حیدری صاحب اپنی کتاب منظوماتِ میاں دلگیرؔ میں پٹنہ میں خوش معرکۂ زیبا کے مخطوطے کے مطابق یہ عبارت تحریر نہ کرتے۔

''سابق میں حسب بیان دلگیرؔ ہنود تھا۔۔۔ جب سے مسلمان ہوئے اپنا نام غلام حسین مقرر کیا۔'' حیدری صاحب نے دلگیرؔ کا نام قبولیتِ اسلام سے پہلے چھنگو لال تحریر کیا ہے۔

یہ ایک اور شہادت ہے کہ دلگیرؔ کے تبدیلیٔ مذہب کی بنیاد صرف اور صرف عشقِ حسینؑ تھا۔

مسیح الزماں صاحب ہی کی کتاب اردو مرثیے کا ارتقا کے صفحہ نمبر ۲۷۹ میں خوش معرکۂ زیبا کا یہ نوٹ ملتا ہے جس سے راقم کو بہت حیرانی ہوئی کہ اس نوٹ میں تبدیلیٔ مذہب کا سن اور وجہ تک بیان کر دی گئی ہے۔

''آخر شوق مرثیہ گوئی سے پیدا ہوا اور طرف وسیلہ کے نجات کے سیّد تاثیر غم امام حسین علیہ السلام سے ''طربؔ'' سے کنارہ کر کے دلگیرؔ تخلص قرار دیا۔ سال ایک ہزار دوصد وسی میں اسلام سے مشرف اور شبیہہ امیر المومنینؑ سے ہم طرف ہوا۔''

اسی عبارت کے مطابق دلگیرؔ نے ۱۲۳۰ میں جو کہ لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کی بادشاہت کا وقت تھا، دلگیرؔ نے اسلام قبول کیا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اپنی کتاب ہندو مرثیہ گوشعرا کے صفحہ نمبر ۳۵ میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری گوشۂ ادیب میں دلگیرؔ کے مرثیوں کے ایک مجموعے کا ذکر کیا ہے جس میں ایک مرثیہ ہے جس کا مطلع درج ذیل ہے۔ اس مرثیے میں دلگیرؔ کا نام غلام حسین درج کیا گیا ہے اور آخر میں سال کتابت بھی درج ہے جو کہ ۱۲۵۸ھ یعنی قبولیتِ اسلام کے ۲۸ سال بعد کا سن ہے۔

''یوں روایت ہے سکینہؑ کو امیرِ شام نے''

دلگیرؔ کا زمانہ

دلگیرؔ کا زمانہ ۱۹ ویں صدی کے اوائل کا زمانہ ہے، دلگیر کی پیدائش ۱۷۸۰ھ کی ہے یعنی جب دلگیر شاعری میں پختگی پا رہے ہیں اس وقت انیسؔ، دبیرؔ اور غالبؔ کی پیدائش ہو رہی ہے، فصیحؔ آپ سے تقریباً ۲۰ سال چھوٹے ہیں اور میر ضمیرؔ جو اس دور میں بہت اہمیت رکھتے ہیں ان کے تقریباً ہم عمر ہیں لہٰذا دلگیرؔ کا زمانہ اس واسطے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ وہ مرثیے کے ارتقا کے دور میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں اور مرثیے کے سنہری دور میں بھی۔ مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے یہ ثابت ہے کہ دلگیرؔ کے علاوہ بھی کافی غیر مسلم مرثیہ نگار رہے ہیں اور خود دلگیرؔ کے زمانے میں رہے ہیں لیکن دلگیرؔ ان سب میں مستند ہیں۔ یہ وہ شاعر ہے کہ جس نے تمام اصنافِ شاعری کو ترک کر دیا اور اپنی زندگی مرثیہ نگاری

کے لیے وقف کردی۔ ایک شاعر کے کلام کی اہمیت ایک شاعر ہی لگا سکتا ہے۔ اپنی زندگی بھر کے غیر مذہبی کلام کو پانی میں بہا دینا کوئی معمولی بات نہیں، الغرض دلگیرؔ کا زمانہ مرثیے میں عجائبات کا زمانہ ہے جہاں مرثیے کے جید شاعر اپنا کمال دکھا رہے ہیں، صرف خلیقؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ ہی نہیں انیسؔ و دبیرؔ کے علاوہ خاندانِ عشق بھی اپنی بلندیوں پر ہے، غرض مرثیہ اس دور کے سخن کا تاج ہے اور ایک ہی وقت میں ایک ہی شہر میں اس کے کئی تاج دار موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک دلگیرؔ ہیں جن کے مرثیے زبان زدِ عام ہیں۔

دلگیر کے مطبوعہ مرثیے

چھنولال دلگیرؔ کے مرثیوں کی ۶ جلدیں ہیں جو کہ www.emarsiya.com کی زینت ہیں۔ دلگیرؔ کی ساتویں جلد کا اعلان تو ہوا مگر وہ منظرِ عام پر نہ آسکی۔ تمام کی تمام جلدیں نول کشور صاحب کے مرثیے پر احسان ہیں۔ ان تمام جلدوں کی تفصیل درج ذیل ہے

جلد	صفحات	سنِ اشاعت
۱۔	۵۰۳	۱۸۸۸ء
۲۔	۵۰۰	۱۸۹۷ء
۳۔	۴۹۶	۱۸۹۷ء
۴۔	۵۰۳	۱۸۸۵ء
۵۔	۵۰۳	۱۸۸۶ء
۶۔	۲۳۲	۱۸۸۶ء

جلد اول میں تعدادِ مراثی ۴۲، دوئم میں ۹۷، سوم میں ۹۱، چہارم میں ۸۷، پنجم میں ۹۱ اور ششم میں ۳۶ ہے یعنی دلگیر کی مطبوعہ جلدوں میں ان کے مرثیوں کی تعداد ۴۱۷ ہے رثائی ادب کے تیسرے شمارے میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے دلگیر کے ۵۶۹ مطبوعہ و غیر مطبوعہ مرثیوں کا اشارہ دیا ہے جن میں مسعود حسن رضوی ادیب کے کتب خانے میں ۱۹۷ اور ۵۵ سید محمد رشید صاحب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ یہ مرثیے آج تک کیوں شائع نہ ہوسکے اور کیوں شائقین مرثیہ اس سے فیض یاب نہ ہوسکے یہ بحث طلب موضوع ہے اور اس موضوع پر بات کرنا اس مضمون کے دائرے میں نہیں آتا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے غیر مطبوعہ مرثیوں کی بازگشت سننے میں آتی رہی ہے مگر جب مطبوعہ مراثی کی بات کریں تو دبیرؔ کو انیسؔ اور دلگیرؔ پر فوقیت رہے گی جن کے مطبوعہ مرثیوں کی تعداد دلگیرؔ اور انیسؔ کے مطبوعہ مرثیوں سے زائد ہے۔ جناب ضمیر اختر نقوی نے دلگیرؔ کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد ۵۴۴ بتلائی ہے جو اکبر حیدری صاحب کی بتلائی ہوئی تعداد سے کم ہے لہٰذا دلگیر نے مراثی کی تعداد دس ہزار ہونا ٹھیک نہیں۔

مطبوعہ مراثی کی فہرست دبیرؔ کے بعد دلگیر کی سب سے طویل ہے۔ چھے مطبوعہ جلدوں میں ۲۰ ہزار سے زیادہ بند دلگیرؔ کی بسیار نویسی پر گواہ ہے۔ زیادہ تر مراثی میں تعدادِ بند ۳۰ سے ۴۵ کے درمیان ہے جبکہ ۲۰ کے قریب مرثیے ایسے ہیں جن میں تعداد بند ۸۰ یا ۹۰ سے زائد ہے۔

دلگیرؔ کی ان کے زمانے میں شہرت

مصحفیؔ کے مطابق بزرگوں کی صحبت سے دلگیرؔ کے کلام میں ایسی پختگی آ گئی تھی کہ اپنے استاد کے ہم پلّہ ہو گئے تھے۔ضمیر اختر صاحب نے دبستانِ ناسخؔ میں حضرتِ ناسخؔ کی دلگیرؔ سے انسیت کو ناسخؔ کی ایک غزل کے اس مقطع کے ذریعے بیان کیا ہے۔

آشنا متحد اس درجہ کہاں ہوتے ہیں
آپ دلگیر ہے ناسخؔ جو ہے دلگیرؔ جدا

فکرِ بلیغ میں استاد ناسخؔ کا یہ واقعہ دلگیرؔ کی ان کے زمانے میں شہرت بیان کرتا ہے۔''ایک دفعہ ناسخ کے سامنے کسی نے دلگیرؔ کا ذکر کیا، اس پر ناسخؔ نے کہا، یہ شخص لغات کی کتابوں کو خوب چھانے ہوئے ہے مگر شاعری میں بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ بغیر استاد کی مدد کے حل نہیں ہوسکتیں۔ مجھے وہ اپنا کلام دکھاتے ہیں تو کچھ سوچ کر ہی دکھاتے ہیں۔کسی نے کہا کہ میر ضمیرؔ تو ان سے ہر طرح سے بڑھے ہوئے ہیں۔ناسخؔ نے منہ بنا کر کہا کہ بھئی یہ بھی تو سمجھو کہ وہ کس بات میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر دلگیرؔ فقط غزلیں ہی کہتا تو قیامت ڈھاتا۔'' فکرِ بلیغ میں ہی ایک اور جگہ درج ہے۔

''میر ضمیرؔ بھی ان کا ادب کرتے تھے اور ان کے کلام کی داد دیا کرتے تھے، جب دلگیرؔ ان کو اپنا کلام سناتے تھے تو میر ضمیرؔ کہہ اٹھتے تھے، واللہ استاد ہو، استاد!''

میر انیسؔ کا یہ واقعہ بھی موجود ہے جو ضمیر اختر صاحب نے دبستان ناسخ میں تحریر کیا ہے مگر حوالہ نہیں مگر ضمیر اختر صاحب جسے انیسیے سے یہ واقعہ بیان ہونا دلگیرؔ کی عظمت کا ثبوت ہے۔

''ایک مرتبہ میر انیسؔ کے سامنے کسی نے دلگیر لکھنوی کا ایک شعر پڑھا سلام کا یہ شعر سن کر میر انیسؔ کہنے لگے، میں اپنے سب دفتر دینے کو تیار ہوں، یہ شعر تھا۔

کہتی تھیں بانوؔ الٰہی کیجیو وارث کی خیر
آج کیوں سر سے ڈھلی جاتی ہے چادر بار بار

ثابت لکھنوی دبیرؔ کے شاگرد ہیں اور دبیرؔ کی زندگی پر مشتمل اپنی کتاب میں یہ واقعہ تحریر کرتے ہیں۔

''کسی مجلس میں میر علی سوزخوان نے دلگیرؔ کا ایک مرثیہ پڑھا، اُس مجلس میں مرزا دبیرؔ بھی موجود تھے، شام کو مرزا دبیرؔ کی محفل میں مرثیے کی تعریف ہوئی تو ایک صاحب نے کہا کہ یہ مرثیہ اگر مل جائے تو کیا کہنا لیکن سوزخوان یہ مرثیہ تقسیم نہ کریں گے۔مرزا دبیرؔ نے کہا اچھا آپ لکھئے، اب جو وہ لکھنے بیٹھے مرزا دبیرؔ نے ایک ایک کر کے سب بند دلگیرؔ کے مرثیے کے لکھوا دیئے۔''

خلاصۃً اس کی شہرت کا کیا بیان ہو کہ جس کے سلام کا مقطع انیس کے دفتر کا بدل ہو، استاد ناسخ جس کا مداح ہو، میر علی جس کے کلام کو سوزخوانی کے لیے فوقیت دے جو کہ اس زمانے کی شہرت کا معیار تھا اور دبیرؔ کا استاد جسے استاد کہہ کر مخاطت کرے۔الغرض دلگیرؔ اپنے زمانے کا وہ شاعر ہے جس کو اپنے دور کے شعرا سے بھی عزت ملی اور آنے والے دور کے شاعروں سے بھی۔دلگیرؔ کے مزاج، سیرت اور کردار پر تحریر واقعات سے اس بات کا

احساس ہوتا ہے کہ دلگیرؔ نے ہمیشہ دوسرے کو عزت دے کر اپنے لیے عزت حاصل کی اور یہی ان کی ترقی اور شہرت کا باعث بنا۔

شادؔ صاحب نے فکرِ بلیغ میں دلگیرؔ صاحب کا حلیہ یوں بیان کیا ہے۔

''دبلے پتلے گوری رنگت کے آدمی تھے۔۔۔ باتیں کرنے میں چنداں لکنت ظاہر نہ ہوتی تھی مگر جب کسی لفظ میں اٹک گئے تو قیامت ہوتی تھی۔ اکثر تنزیب یا جامدانی کا کرتا اور بنارس کے مشروع کا بردار پائجامہ اور زردوزی گھتیلا پہنا کرتے تھے۔ خاک پاک کے بڑے دانوں کا کنٹھا گلے میں ڈالے رہتے تھے۔''

شادؔ صاحب نے دلگیرؔ کی لکنت کا اپنی کتاب میں تذکرہ کیا ہے۔

''منبر پر خود اپنے کلام پڑھنے کا شوق تھا۔ لکنت کا یہ حال کہ کبھی گھنٹوں تک ایک جگہ بھی نہ الجھتے تھے اور کبھی یہ حال تھا کہ کسی لفظ میں الجھ گئے تو گھڑیوں تک وہ لفظ ادا نہ ہوسکا اور ناچار منبر سے اتر آئے۔ احتیاطاً کوئی شخص منبر کے پہلو پر کھڑا کر دیا جاتا تھا تو وہ مدد دیتا جاتا تھا۔''

دلگیرؔ کی زندگی میں یہ لکنت ظاہری ثابت ہوئی اور بین کی یہ لکنت ان کے کلام کی روانی اور بسیار گوئی پر حاوی نہ آسکی جس کی گواہی دلگیرؔ کے چار سو سے زیادہ مطبوعہ مراثی دے رہے ہیں۔

دلگیرؔ کو کربلا جانے کی بہت تمنا تھی لیکن مقدر میں نہ تھا اس لیے جا نہ سکے،

شادؔ صاحب کے مطابق دلگیر کے سلام ان کے مرثیوں کی نسبت زیادہ چھپے دلگیرؔ کے دور کے نامی مرثیہ خواں سوزخواں حضرات کی اس قدر فرمائشیں تھیں کہ مہلت نہ ملتی تھی۔ شادؔ نے سلام میں مسلسل شعروں کے علاوہ غزل کے طور پر کوئی کوئی مدحیہ شعر کہہ دینے کو دلگیرؔ کی ایجاد قرار دیا ہے۔

دلگیرؔ کے دور میں ان کے مرثیہ نگاری وہ شہرت حاصل نہ کرسکی جو دلگیرؔ کے سلاموں کو نصیب ہوئی۔ دلگیرؔ کے ہم عصر مرثیہ نگار جن میں خلیقؔ، ضمیرؔ اور فصیحؔ قابلِ ذکر ہیں خود اپنا کلام منبر پر پڑھا کرتے تھے جب یہ ان کے شاگرد اس کی نقلیں لے جاتے تھے اور یوں ان کی مرثیہ نگاری کا فروغ ہوتا تھا۔ دلگیرؔ چونکہ لکنت کے سبب خود پڑھنے سے احتیاط کرتے تھے لہٰذا ان کے مرثیے سوزخوانوں اور مرثیہ خواں حضرات کی توجہ کا طالب رہے۔

دلگیرؔ کی مرثیہ نگاری

اس مختصر مضمون میں دلگیرؔ کی مرثیہ نگاری کو مفصل بیان نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے لیے مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ دلگیرؔ کے مرثیے سادہ زبان اور بیان کی روانی سے لبریز ہیں۔ انسانی اقدار، رشتوں کی اہمیت اور منظر نگاری ان کا خاصہ ہے۔ زیادہ تر مرثیے ۳۰ سے ۵۰ بند پر مشتمل ہیں اور درد وغم کی کائنات سمیٹے ہوئے ہیں۔ دلگیرؔ کی شاعری خلوص کی شاعری ہے، دلگیرؔ کی زبان ان کے دور کی زبان ہے، ان کے معاصرین کی زبان ہے پیدائشی مسلمان نہ ہونے کے باوجود دلگیرؔ جب روایتیں تحریر کرنے پر آتے ہیں تو مستوراتِ اہلِ بیتؑ، طفلان اہلِ بیتؑ و جوانانِ اہلِ بیتؑ کے درمیان مکالمات، روایتیں، بول چال اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ رتی برابر کمی محسوس نہیں کی جاسکتی۔ دلگیرؔ کی زبان صاف ہے، فصیحؔ ہے اور سلیسؔ ہے اور اپنے ہم عصروں میں ان کا مقام فصیحؔ و ضمیرؔ و خلیقؔ کے ہم پلہ ہے۔ فنی خصوصیات سے بھرپور ہے۔ یہ ضرور ظاہر ہے کہ دلگیرؔ کے مرثیے، نسبتاً کم تمہید و چہرے کے، روایتوں کے بیان کے بعد مصائب کی طرف راغب ہیں لہٰذا مضمون آفرینی اتنی

نہیں جتنی ضمیرؔ کے یہاں موجود ہے مگر دلگیرؔ کے مرثیے اسی وجہ سے ان کے انداز کے حامل ہیں۔ دلگیرؔ نے اپنے مرثیوں میں مختصر روایتوں کے بیان کے بعد مصائب کا انداز اختیار کیا ہے، ان کے نزدیک مرثیہ اہلِ بیتؑ کے مصائب کا بیان ہے شاعری کی تعریف کا میزان نہیں۔ دلگیرؔ وہ شاعر ہے کہ جو تعلّی سے بھی گریز چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک مرثیہ نگاری ایک ذمہ داری ہے جو وہ ادا کررہا ہے جس کا صلہ وہ دربارِ اہلِ بیتؑ سے چاہتا ہے۔

ہو قبولِ شۂ کونین کلامِ دلگیر
یہی دلگیرؔ دعا صبح و مسا کرتا ہے

دلگیرؔ کے مرثیے عقیدت کی انتہا ہیں۔ چہرہ چاہے مختصر ہی سہی مگر اخلاقی قدروں سے پُر ہے۔ دلگیرؔ کے مرثیوں میں منظر نگاری صرف خاندانِ اہلِ بیتؑ کے گرد گھومتی ہے مناظرِ قدرت کا بیان وہ عمومی سمجھتے ہیں۔ رخصت کا بیان ان کے مرثیوں میں توجہ کا باعث ہے، سراپا ان کے کلام کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔

دلگیرؔ کا کلام واقعہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے، رجز کا بیان عقیدتِ آلِ محمدؐ سے بھرپور ہے الفرض قادر الکلامی دلگیرؔ کے مرثیوں کا خاصہ ہے۔

خلاصۃً یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ دلگیرؔ کے مرثیوں کو پڑھنا بہت ضروری ہے، دلگیرؔ وہ مرثیہ نگار شاعر ہے جس کے اہلِ ہنود ہونے پر زیادہ گفتگو کی جاتی ہے، جس کی سلام نگاری پر زیادہ بحث ہوتی ہے مگر مرثیہ نگاری کو طاق پر رکھ دیا گیا ہے۔ ارتضیٰ عباس نقوی صاحب کی کوششوں سے دلگیرؔ کے مرثیوں کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کرنے کا منصوبہ دلگیر کے مرثیت کو عوام الناس تک رسائی کا باعث بنے گا۔

گھبرائے گی زینبؑ

''گھبرائے گی زینبؑ'' وہ سلام ہے جو برِصغیر پاک و ہند میں عشرۂ محرم کے اختتامی کلام کے طور پر مشہور ہے۔ یہ روایت کئی دہائیوں سے پاک و ہند میں موجود ہے کہ دس محرم میں امام حسینؑ کے پرسے کے لیے منعقد مجالس جنہیں شامِ غریباں کہا جاتا ہے ان میں سلام آخر کے ساتھ ساتھ گھبرائے گی زینبؑ بھی پڑھا جاتا ہے۔ پہلے پہل یہ جناب آلِ رضا کے نام سے منسوب ہوا پھر اسے دلگیرؔ سے منسوب کیا گیا اور عاشور کاظمی صاحب نے اسے اپنی کتاب اردو مرثیے کا سفر میں مراثیٔ دلگیر کی پہلی جلد میں شامل بتلایا ہے۔ جب کہ یہ کلام اس جلد میں شامل نہیں۔

کلامِ دبیرؔ

دلگیرؔ کا کلام واقعہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ الفرض قادر الکلامی دلگیر کے مرثیوں کا خاصہ ہے۔ بقول مصحفیؔ ''وہ فنِ مرثیہ گوئی میں بے مثال اور صاحبِ کمال تھے۔ جب کہ یہ کلام اس جلد میں شامل نہیں۔''

رجب علی بیگ سرور فرماتے ہیں۔

''مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطنی نیک ضمیر خلیق فصیح مرد مسکین مکروہاتِ زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب سکندرؔ طالع بصورت گدا بارِ احسانؔ اہلِ دول کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوانِ کثیر فرمایا۔''

لالہ سری رام خخانۂ جاوید کی جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۱۹۴ میں دلگیر کے بارے میں فسانۂ عجائب میں لکھتے ہیں۔

''اور چونکہ صاحبِ استعداد تھے اس میں اچھا نام پایا۔۔۔نواب سعادت علی خان اور غازی الدین حیدرؔ کے زمانے کے مرثیہ گویوں کے سرتاج سمجھے جاتے تھے جب میر انیسؔ نے مرثیہ کہنا شروع کیا تو ان کا عالمِ ضعیفی تھا۔

دلگیرؔ مرثیے کے دور کی اس تاریخ کی نمائندگی کرتے ہیں جو مرثیے کا تعمیری دور کہلاتا ہے اس دور کے مرثیہ نگاروں میں دلگیرؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ اور خلیقؔ قابلِ ذکر ہیں۔ موازنے کی ضرورت اس وجہ سے نہیں کہ یہ سب باغ رثا کے پھول ہیں جن کی رنگت اور خوش بوا لگ الگ ہے۔

میاں دلگیرؔ کا انتقال ۶۹ برس کی عمر میں ۱۲۶۴ ہجری میں ہوا نخاس میں لبِ سڑک ان کی قبر آج بھی مشہور ہے جسے ٹیڑھی قبر بھی کہا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے معروف محقق جناب مسعود حسن رضوی ادیب نے اس قبر کی نشان دہی پروفیسر اکبر حیدری کو کروائی جسے انہوں نے اپنی کتاب ''ہندو مرثیہ گو شعرا'' کے صفحے نمبر ۷۳ پر درج کیا ہے۔

تاریخِ وفات درج ذیل ہیں۔

در گلشن خلد باجمیع شہدا
کشتہ پابوس مرثیہ گو دلگیرؔ
تاریخ وفات اونو شتم اے رشکؔ
آہ افسوس مرثیہ گو دلگیر

(رشکؔ لکھنوی ۱۲۶۴ ھجری)

آہ آہ از جہانِ فانی شد
مرثیہ گوئے شاہِ عرش نظیر
گفت ہاتف اسیرؔ تاریخش
وائے دلگیرؔ عاشقِ شبیرؔ

نوٹ: یہ مضمون راقم نے دو تین سال قبل مجلس ترقیِ ادب لاہور کے منصوبے دلگیرؔ کے مرثیے کے ابتدائیے کے طور پر لکھا تھا۔ چونکہ اس کتاب کے آنے کے اب کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے لہٰذا یہ اب مضمون کی صورت فروغِ مرثیہ کے تیرھویں شمارے کی زینت ہے، بھلا ہو ارتضیٰ عباس صاحب کا جنھوں نے کلامِ دلگیرؔ کو دوبارہ روشناس کروایا اور دلگیرؔ کو اس دور میں دوبارہ زندگی دی۔

❀❀❀❀

اشاریۂ انیسؔ
(زیرِ طبع)

اشاریۂ دبیرؔ
(زیرِ طبع)

اردو مرثیہ اور انسانی اقدار

ڈاکٹر (پروفیسر) سید علی عرفان نقوی

مرثیہ اور مرثیہ نگاروں پر معترضین آج کچھ بھی لکھیں یا کہیں اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرثیہ کی طرح اردو کی ہر بڑی صنفوں پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ غزل جیسی صنف پر سڑاس کی بو سے لیکر نیم وحشی صنف تک کا الزام لگایا گیا لیکن آج غزل پہلے سے زیادہ ہر دل عزیز اور مبتدی سے لیکر اساتذہ فن کے لیے بھی کشش کا سبب بنی ہوئی ہے۔ ہمارے برادرِ وطن جنہیں اردو بھی نہیں آتی وہ بھی اس پر فریفتہ ہیں۔ ٹھیک اسی طرح مرثیے کے متعلق یہ کہنا کہ مرثیہ میں گریہ و زاری کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور اسی وجہ سے آج مرثیہ رو بہ زوال ہے۔ میری نظر میں تنگ نظری کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مرثیہ ایک خاص موقع اور ماحول میں پیدا تو ضرور ہوا لیکن اس نے ہر مکتبہ فکر و نظر اور سن و سال نیز ہر بشر کو اپنی طرف متوجہ ضرور کیا ہے۔ مسلمان کی بات کیا مرثیہ گویوں میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ آج مرثیہ لکھنے والا بگڑا شاعر نہیں بلکہ معتبر اور عظیم شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اور مرثیہ اردو کی پانچ بڑی اصناف میں سے ایک صنف کہلاتی ہے۔ مرثیے میں غزل کا رنگ، قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا انداز، رباعی کا ناصحانہ پہلو اور نظم کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس میں تاریخی حقائق بھی ہیں اور ادبی شان بھی۔

بقول ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی:

''مراثی میں غزل کی لطافت، قصیدے کا آہنگ، مثنوی کا تسلسل، رباعیات کا طرزِ فکر، ڈراموں کا تحیر اور نقطہ عروج، رزم نگاری کا ہمہمہ و رجز، تلوار کی جھنکار، موسیقی کی چہار، مظلوم کی فریاد۔ غرض یہ کہ کتنے اسالیب، کتنی کیفیتیں، کتنے پیکر مرثیے کے دامن میں یکجا موجود ہیں جس کا اعتراف اکثر ناقدینِ فن نے اپنے اپنے انداز اور الفاظ میں کیا ہے۔'' (معاصرینِ مرزا دبیر: تقابلی مطالعہ صفحہ ۱۳۷)

ظاہری آنکھوں سے مطالعہ کرنے والوں کو اردو مرثیہ زوال پذیر ہوتا نظر آتا ہو تو آئے لیکن سچ تو یہ ہے کہ کربلائی مرثیہ بعدِ واقعہ کربلا مختلف ہیئتوں میں نمو پزیر ہوا اور عہدِ انیسؔ و دبیرؔ میں پہنچ کر یہ مسدس کے پیکر میں کچھ اس طرح بھلا معلوم ہونے لگا کہ یہی ہیئت دوسری شعری صنفوں کے مقابلے منفرد اور سدا کی پہچان بن گئی۔ آج اردو مرثیوں کے موضوعات میں کیا نہیں ہے۔ بزم سے لیکر رزم، منظر کشی سے لیکر جذبات نگاری اور انسان سازی سے لیکر اخلاقیات کی تعلیم تک کا بیان ملتا ہے۔ مرثیے کے موضوعات سے متعلق ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی نے اپنی کتاب معاصرین مرزا دبیرؔ کے صفحہ ۶۵ اور ۶۶ پر بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:

''مرثیہ کی وسعت اور آفاقیت میں مرثیہ نگار شعراء نے اپنے کمالِ فن سے انسانیت اور شعر و ادب کے امتزاج سے ایک نئی شان پیدا کر دی ہے۔ اس عظیم واقعہ کو اپنا موضوع بنا کر مرثیہ نگاروں نے ان اقدار کی ترجمانی کی ہے جو بلا لحاظ مذہب و ملت انسانیت کی مشترکہ میراث ہیں۔ اکثر مراثی میں واقعہ کربلا کی منطقی موشگافیوں کر کے واقعاتِ کربلا کے اسباب اور عوامل کے ذریعے اس المیہ کے اخلاقی پہلوؤں

کونمایاں کیا ہے۔گریہ وبکا اور معتقدات کی سطح سے بلند اپنی نوعیت کے اعتبار سے اکثر مراثیِ انسانی اور اخلاقی اقدار کو کمال تک پہنچانے کا وسیلہ بن کر سامنے آتے ہیں، واقعہ کربلا بجائے خود طہارت اور تزکیہ نفس کی بہت بڑی قوت رکھتا ہے۔''

اگر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ یا پھر دیگر مرثیہ نگاروں نے اس صنف کو ممدوحین کے قصوں سے جوان کیا ہوتا تو اس میں بھی داستانِ بزم وہجر اور عشق و عاشقی کے قصے تو ہوتے لیکن ممدوحین کی داستانِ شجاعت عنقا ہوتی اور اخلاقیات وانسان سازی ناپید ہوتی۔

مرثیے چاہے کلاسیکی ہوں یا جدید انیسؔ و دبیرؔ کے بعد بھی مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔ یہ الزام لگانا کہ اردو مرثیہ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد تخلیق نہیں ہورہے ہیں غلط ہے۔آج اسی پروپیگنڈہ کی وجہ سے ملک اور بیرونِ ملک کے اکثر کالجز اور یونیورسٹیوں کے نصاب سے اردو مرثیہ کا اخراج ہو چکا ہے۔آیئے میر انیسؔ و دبیرؔ کے بعد کے مرثیہ نگاروں کی فہرست دیکھئے:

واجد علی شاہ، جمیلؔ مظہری، نسیمؔ امروہوی، جوشؔ ملیح آبادی، آلِ رضا، نجمؔ آفندی، شمیمؔ کرہانی، وحیدؔ اختر، پیامؔ اعظمی، مہدیؔ نظمی، معجزؔ سنبھلی، علی مہدی، بلرام پوری، احسنؔ رضوی داناپوری، صفدرؔ حسین، ساحرؔ لکھنوی، فیضؔ بھرت پوری، سردارؔ نقوی، ظہورؔ جارچوی، یاورؔ اعظمی، امیدؔ فاضلی، شفقتؔ کاظمی، قیصرؔ بارہوی، شاہدؔ نقوی اور ڈاکٹر ہلال نقوی وغیرہ ایسے مرثیہ نگاروں کے اسمائے گرامی ہیں (بہت سے نام یقیناً طوالت کی وجہ سے رہ گئے ہیں) جس کے پیشِ نظر یہ کہنا کہ انیس و دبیر کے بعد اردو میں مرثیہ نگاری نہیں ہورہی ہے میرے خیال میں تعصب کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آج میں بانگ دہل یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر مرثیہ کو ایک فرقہ کی چیز سمجھ کر شعوری طور پر کچھ افراد نے پڑھنے یا پڑھانا سے خود کو علیحدہ نہ کیا ہوتا تو موجودہ عہد کے معاشرے میں اخلاقی گراوٹ سے لیکر رشتوں کی باگ دوڑ کمزور نہ ہوئی ہوتی۔آج کا زمانہ بھی تعلیمی، اخلاقی، قومی ہم آہنگی اور رشتوں کی پسماندگی کے نقطِ نظر سے میر انیسؔ و دبیرؔ کے عہد سے کچھ کم نہیں ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ مرثیہ نگاروں کے ممدوحین یا کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے اصحاب اور عزیز واقارب انسانی اقدار سے عاری، رشتوں کے تقدس سے ناواقف اور اخلاقی و تعلیمی لحاظ سے پست تھے۔ بلکہ امام حسین علیہ السلام کی فوج کا ایک ایک فرد فرض شناس، وفا شعار، اطاعت گزار، فرمابردار باایمان، امن وامان کا خواستگار، تقوی و پرہیزگار اور شریعتِ محمدی کا نگہبان تھا۔لیکن مرثیہ نگاروں بالخصوص میر انیسؔ و دبیرؔ نے ان ممدوحین کی جو تصویریں ادبی پیرائے میں ابھار کر بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کے لئے ٹھانی، اس کی نظیر اردو کی دیگر صنفوں میں نہیں ملتیں۔

آج آپ کو اردو کے ساتھ ساتھ دنیا کی دیگر زبانوں کی شاعری میں عورت کا مرد سے، مرد کا عورت سے یا باپ کا بیٹے سے یا بیٹے کا باپ سے یا بھائی کا بھائی سے یا بہن کا بھائی سے اور بھائی کا بہن سے، پیار کا ایک آدھ نمونہ تو مل سکتا ہے لیکن ماں کا بیٹے سے اور بیٹے کا ماں سے، چچا کا بھتیجی سے اور بھتیجی کا چچا سے، بیوی کا شوہر سے اور شوہر کا بیوی سے پیار اور محبت یا ایک خاندان کے تمام افراد کا آپس میں اپنے اپنے مراتب کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے جذبہ ایثار وقربانی اور محبت کا کوئی نمونہ ایک ہی صنف میں ملنا ناممکن ہے۔مگر ہمارے مرثیہ نگاروں نے جہاں رشتے داروں کی محبت کا ذکر کیا وہاں دشمنوں کے لشکر اور جانوروں کو مصیبت زدہ دیکھ کر ان سے ہمدردی اور محبت کی بھی مثالیں مرثیے میں پیش کیں ہیں۔ایسی مثالیں اردو تو کیا دیگر زبانوں کی شاعری میں بھی نہیں ملتیں۔قارئین کے سامنے میر انیسؔ کے مرثیے سے ایسی

ہی کچھ مثالیں اخلاقیات اور انسان سازی کی پیش کی جاتی ہیں:

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوشخصال — ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاسِ ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال — اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے امیدوار ہیں

بے مثل تھے رسولؐ کے لشکر کے سب جواں — لیکن ہمارے جد کو نبیؐ نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا منھ لشکرِ گراں — پایا علم علیؑ نے مگر وقتِ امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انہی کے ہیں انہی کے نواسے ہیں

مذکورہ بالا بند میں میر انیسؔ نے بچوں کی نفسیات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ احترام کا پاس بھی ہے لیکن علم حاصل کرنے کی دل میں خواہش بھی ہے اور اس کی ان بچوں کے دل و دماغ میں معقول وجہ بھی ہے۔ اس جگہ اگر کوئی دوسری عورت ہوتی تو کسی نہ کسی طرح سے اپنے بچوں کی حمایت کرتے ہوئے اپنے بھائی سے اس کا اظہار کر دیتی لیکن اس اٹھتے ہوئے جذباتی شعلوں کو جس خوبصورتی اور سلیقے سے جناب زینب نے سرد کیا ہے اس کا جواب نہیں۔ اس انداز کے جملے ایک اعلیٰ درجے کی ماں ہی ادا کر سکتی ہے جہاں بچوں کی دل شکنی بھی نہ ہو اور اس کے اندر کی انسان سازی بھی ہو جائے اور وہ امام کے رتبے اور مرتبے کو سمجھیں کہ کل کائنات کا مختار وقت کا امام ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ جسے چاہیں علم دے۔ خیر اب بند ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کس طرح ایک ماں اپنے بچوں کی کردار سازی کر رہی ہے:

زینبؑ نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام — کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امامؑ
دیکھو نہ کیجیو بے ادانہ کوئی کلام — بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبرؑ کو چھوڑ کے

ہمارے اردو مرثیوں نے انسان کو اس کے اعلیٰ اقدار کی طرف بھی راغب کیا ہے۔ برائیوں سے دور اور اچھائیوں سے قریب ہونے کی بھی تعلیم دی ہے۔ علاوہ ازیں حقوق اللہ اور حقوق العباد پر بھی کافی ضرور دیا ہے اور معاشرتی ذمہ داریوں اور عدل و انصاف نبھانے کو بھی اہم قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی نے اپنی کتاب ''معاصرینِ مرزا دبیر: تقابلی مطالعہ'' کے صفحہ ۱۶۹ اور ۹۷ میں لکھتے ہیں کہ:

''حق و باطل میں فرق قائم کرتا ہے اور کہیں باطل حق کے راستے میں آتا ہے تو اس کا مردانہ وار مقابلہ شعوری طور پر کرنے کا درس دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مرثیہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کی رغبت دیتا ہے۔۔۔۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس اور بنیادی فرائض کی ادائیگی کی تعلیم و تلقین مرثیہ میں ملتی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر انیسؔ نے امام حسین علیہ السلام کے ذریعہ اپنے مرثیے میں انسان کی خطا اور پھر اسکی ندامت پر معاف کرنے کا

جو درس دیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ایک انسان اپنے دوست اور عزیز و اقارب کے گناہ اور پھر اس پر توبہ کر لینے پر معاف کر دیتا ہے لیکن کیا آپ نے کسی ایسے انسان کو دیکھا ہے کہ اس نے اپنے ایسے دشمن کہ جس کی وجہ سے اس کی اور اس کے اہل وعیال کی زندگی برباد ہوئی ہو اس کے اس گناہ کو درگذر کر دیا ہو؟ لیکن ہمارے مرثیہ نگاروں نے اپنے ممدوح حضرت امام حسین علیہ السلام کے ذریعے حضرت حرؑ کے گناہ کی معافی کی مثالیں نہ صرف پیش کیں بلکہ جناب حر کا خیامِ حسینیؑ کی جانب آتا دیکھ حضرت امام حسین علیہ السلام کا اپنے بیٹے اور بھائی کے ذریعے استقبال کے اخلاقی جذبہ کو بھی پیش کیا ہے:

حرؑ نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ دوڑ کر چوم لیے پائے شہِؑ عرشِ سریر
شہؑ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے باتوقیر میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضامند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباسِؑ دلاور کے برابر ہے تو
کہہ کے ساتھ لئے حرؑ کو چلے شاہِ امم ہاتھ میں ہاتھ تھا مہماں کا اللہ رے کرم
راس و چپ قاسمؑ و اکبرؑ تھے زہےِ شان و حشم سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرتِ عباسؑ علم
دور سے اہلِ خطا تیر جو برساتے تھے
رفقاء سائے میں ڈھالوں کے لئے آتے تھے

اخلاقیات کے باب میں احسان فراموشی گناہ ہے۔اگر کسی نے آپ پر کوئی احسان کیا ہے تو اس کے احسان کا بدلہ اسی طرح احسان کر کے ادا کرے یا کم از کم اپنے محسن کے احسان کو زبان سے ادا کر کے اس کا حق ادا کرے۔اور اگر کوئی یہ عمل نہیں کرتا ہے تو وہ احسان فراموش کہلاتا ہے۔ذیل کے بند میں میر انیسؔ نے عونؑ و محمدؑ کی زبان سے اسی اخلاقی قدر کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔عون و محمد کے ساتھی ہیں اور وہ عون و محمد سے یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی بقاء کے لئے جنگ و جدال میں اگر جانا ہی ہے تو امام حسین جائیں لیکن عون و محمد مدینے میں رہ جائیں۔اس پر عون و محمد اگرچہ کمسن ہیں لیکن ایسا جواب دیتے ہیں کہ ان کے دوست حیرت میں پڑ جاتے ہیں:

ہم جولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیوں کر ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حقِ غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہؑ پہ فدا ہوں

اس سلسلے میں ایک اور مثال ملاحظہ کریں کہ حضرت حرؑ جب لشکرِ یزید میں رہتے ہوئے امام حسینؑ کی مدحِ عمر سعد کے سامنے کرتے ہیں تو عمرِ سعد یہ سن کر حضرت حرؑ پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا ہے جس پر حضرت حرؑ ایک تاریخ ساز جواب دیتے ہیں:

حرؑ پکارا کہ زباں بندی کر او ناہموار قابلِ لعن ہے تو اور وہ تیرا سردار
ابنِ زہراؑ ہے جگر بندِ رسولِؐ مختار میرا کیا منھ جو کروں مدحِ امامِؑ ابرار

اک زمانہ صفتِ آلِؑ عبا کرتا ہے
آپ قراں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے
وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیونکر لائے تین سو آیے ہوں تعریف میں جن کی آئے
کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رتبے پائے اپنا محبوب و ولی جس کو خدا فرمائے
الفتِ آل میں مریئے تو خوش اقبالی ہے
سنگ ہے ان کی محبت سے جو دل خالی ہے

دنیا جانتی ہے کہ مفاد پرستی کے تحت اگر کوئی شخص ایک جماعت سے نکل کر دوسری جماعت کو اپناتا ہے تو اس کا یہ عمل قابلِ نفرت ہی نہیں بلکہ جرم کے مترادف قرار پاتا ہے۔ جہاں سے وہ نکلتا ہے وہاں تو قابلِ نفرت قرار پاتا ہے لیکن جس گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے وہاں کے لوگوں میں بھی مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

لیکن میر انیسؔ کے مرثیہ میں حضرت حرؑ کا یہ کردار جو اپنے وجود میں ڈالی ظلم واستبداد کی بیڑی کو توڑتے ہوئے اور بقائے اسلام وانسانیت کے لئے یزید کے لشکر سے نکل کر خیامِ حسینیؑ کی طرف آتا ہے، ایک بلند اخلاقی اقدار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور حضرت حرؑ کا یہ عمل نہ صرف رہتی دنیا کے انسانوں کی نظروں میں تعریف کے قابل ہے بلکہ اللہ اور رسول کی نگاہوں میں بھی پسندیدہ اور جرت مندانہ عمل سمجھا جاتا ہے:

واہ رے طالعِ بیدار رہے عزت و جاہ حرؑ پہ کیا فضلِ خدا ہوگیا اللہ اللہ
پیشوائی کو گئے آپ شہِؑ عرش پناہ خضرِ قسمت نے بتادی اسے فردوس کی راہ
مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہوا
بخت ایسے ہوں اگر ہو تو نصیب ایسا ہو
نار سے نور کی جانب اسے لائی تقدیر ابھی ذرہ تھا ابھی ہوگیا خورشیدِ منیر
شافعِ حشر نے خوش ہو کے بخل کی تقصیر تکیہ زانوئے شبیرؑ ملا وقتِ اخیر
اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا
جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفاء میں پایا
آیا کس شوق سے کعبے کی طرف چھوڑ کے دیر کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اسے غیر
حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر فتنہ و شر سے بچا ہوگیا انجام بخیر
ذکرِ خیر اس کے موئے پر بھی ہوئے جاتے ہیں
عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں

اخلاقیات اور انسان سازی کا جتنا مضمون اور جتنی خوبصورت مثالیں ہمارے اردو مراثی میں ملتی ہیں اور کہیں بھی نظر نہیں آتیں۔ صلح رحمی ہو یا صبر وتحمل ہو عدم تشدد کی بات ہو یا لڑائی میں سبقت نہ کرنے کی تعلیم ہو عدل وانصاف کا معاملہ ہو یا بزرگ واساتذہ کے احترام کی باتیں وغیرہ یہ وہ اخلاقی باتیں ہیں جو اردو مراثی میں جگہ جگہ شعری پیرائے میں دکھائی دیتی ہیں۔

ذیل کے اس بند کو ملاحظہ کریں کہ جہاں استاد کے احترام کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔حضرت قاسمؑ نے حضرت عباسؑ سے فنونِ جنگ سیکھے تھے۔اس لیے کربلا میں دوران جنگ اپنے ہنر کا مظاہر کرتے ہوئے یزیدی لشکر کے چند نامی گرامی بہادر کو واصلِ جہنم کرتے ہیں تو حضرت عباسؑ حضرت قاسمؑ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں جس پر حضرت قاسمؑ کہتے ہیں کہ:

قاسمؑ سے پھر کہا کہ مبارک تمہیں ظفر تسلیم کی ادب سے چچا کو جھکا کے سر
اورعرض کی یہ دور سے ہاتھوں کو جوڑ کر اقبال آپ کا کہ مہم ہوگئی یہ سر
پشتی پہ آپ جب ہوں تو پھر کیا ہراس ہو
کام آئے کیوں نہ راس جو استاد پاس ہو

پوری دنیا جانتی ہے کہ کربلا کی جنگ امام حسینؑ نے دفاعی انداز میں لڑی تھیں۔اللہ والے اور خاندانِ نبیؐ کے افراد کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ انہوں نے کبھی اپنی طرف سے جنگ کی شروعات نہیں کی ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے اخلاق اور کردار سے اسلام کے پیغام کو عام کیا ہے۔ چنانچہ کربلا کی جنگ بھی یزیدی لشکر کی جانب سے امام حسین علیہ السلام پر تھوپی گئی تھی۔یزید اپنے بزرگوں کے خون کا انتقام لینا چاہتا تھا لیکن امام حسینؑ نے یزید کے اس مقصد کو ناکام کرتے ہوئے ہر موڑ پر اپنے ساتھیوں کو دفاع کرنے کی تعلیم دی۔لہٰذا جب یزیدی لشکر دریا کے کنارے سے خیامِ حسینیؑ کے ہٹانے کی بات کرتا ہے تو حضرت عباسؑ للکارتے ہوئے کہتے ہیں:

تم کون ہو حسینؑ ہے مختارِ خشک و تر ان کے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاوں نہ رکھنا ترائی میں

حضرت عباس علیہ السلام کے جاہ وجلال اور غیض وغضب سے جناب زینب سلام اللہ علیہا واقف تھیں۔چنانچہ جب یزیدی لشکر خیامِ حسینیؑ کو دریا سے ہٹانے کی ضد کرنے لگا تو حضرت عباسؑ بپھر گئے۔اور کہا کہ کس کی مجال ہے کہ وہ حضرت عباسؑ کے رہتے ہوئے خیام حسینی کو نہرِ فرات کے پاس سے ہٹا دے۔اس وقت حضرت عباسؑ کا جاہ وجلال کچھ ایسا تھا کہ یقیناً اسی لمحہ جنگ چھڑ جاتی اور جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی ہو جاتا لیکن اس لمحہ حضرت عباس کو جناب زینبؑ بلواتی ہیں اور جو کچھ فرمایا اسے مرثیہ نگاروں کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

زینبؑ پکاریں پیٹ کے بازو بصد ملال ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انہیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال غربت پہ ابنِ فاطمہ کی تم کرو خیال
قربان ہوں گی میں نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصہ کو تھام لو

❁❁❁

دبیرؔ کے مرثیے

(جلد چہارم)

زیرِ طبع

-----﴿تحقیق وتدوین﴾-----

اصغر مہدی اشعر
فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل، کینیڈا